جامعہ مدنیہ لاہور کا ترجمان

ماہنامہ

الحامد

صفر المظفر ۱۴۳۲ھ/جنوری 2011ء

جامعہ مدنیہ کریم پارک راوی روڈ لاہور
7704595,7720187

مَدَحْتُ عَلِمْتُ أَنَّهُ شَافِعٌ

ثِمَالُ الْعَدِيْمِ نَبِيٌّ كَرِيْمٌ
عَلَيْهِ صَلٰوةٌ عَمِيْمٌ مُقِيْمٌ

عِصَامُ الْأَرَامِلِ تَقِيٌّ مُبِيْنُ
رَسُوْلُ الْوَرٰى خَاتَمُ الْمُرْسَلِيْنَ

يُنْزَلُ عَلَيْهِ وَحْيُ الرَّحِيْمُ
قَوِيٌّ عَلَيْهِ رَؤُفٌ رَحِيْم

نَبِيُّ الْبَرَايَا نَجِيُّ الْمَلَكْ
أَمِيْنٌ ،عَلِيْمٌ، نَبِيُّ الْمَلَكْ

داع ، صَدُوْقٌ ، نَصُوْحٌ ، حَسِيْب
مُنَادٍ ، فَصِيْحٌ ، نَقِيْبٌ ، مُنِيْبُ

كنز غناًمه سَيِّدُ الْأَغْنِيَاءِ
جَوَّادٌ ، وَصُوْلٌ ، غِمَامٌ السَّخَاءِ

جَمِيْلٌ ، ضَحُوْكٌ ، سَعِيْدُ الْفَتٰى
مَشِيْحٌ ، كَحِيْلٌ ، رَسُوْلُ الإِلٰهِ

مُلْقَى الْوَحْيِ سَيِّدُ الْأَنْبِيَاءِ
مُصْطَفٰى ، مُجْتَبىٰ ، مُرْتَضٰى ، مُرْتَجىٰ

وَاخْتَارَهُ اللّٰهُ نَبِيَّ الْمَلْحَمَةِ
بَشِيْرٌ ، نَذِيْرٌ ، نَبِيَّ الْمَرْحَمَةِ

حَسِيْبٌ ، نَجِيْبٌ ، دَعْوَةُ إِبْرَاهَام
عَلَيْهِ أَلْفُ صَلاَةٍ وَأَزْكٰى سَلامٍ

سَابِقٌ ، خَاتِمٌ ، صَادِعٌ مَا اُمِرُ
ذَكِيٌّ عَلِيْمٌ ، فَهِيْمٌ مَا اُشِرُ

اَعْلَمُ ، اَجْوَدُ ، اَفْصَحُ اَسْعَدُ
اَعْبَدُ ، اَسْجَدُ ، اَعْرَفُ ، اَقْرَبُ

مَدَحْتُ عَلِمْتُ أَنَّهُ شَافِعٌ
وَبِأُذْنِ الرَّحِيْم كَلامُهُ نَافِعٌ

علمی دینی اور اصلاحی مجلّہ

ماہنامہ

لاہور

جلد نمبر: 3 | صفر المظفر ۱۴۳۲ھ/ جنوری 2011ء | شمارہ نمبر: 8

نگران

حضرت اقدس مولانا سید رشید میاں دامت برکاتہم

مدیر

مفتی محمد سعید خان

زرِ تعاون

فی شمارہ: 30 روپے، ششماہی: 150 روپے، سالانہ: 300 روپے

بیرون ملک

امریکہ، تھائی لینڈ، جنوبی افریقہ
ویسٹ انڈیز، ناروے وغیرہ 30 امریکی ڈالر
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط
بحرین، ایران، عمان، انڈیا وغیرہ 25 امریکی ڈالر
بنگلہ دیش 20 امریکی ڈالر

مجلس مشاورت

- مولانا شیر الرحمٰن
- مولانا حبیب اللہ اختر
- محمد اورنگ زیب اعوان

کمپوزنگ: سہیل عباس

پتہ برائے خط و کتابت و ترسیل زر

دفتر "الحامد" جامعہ مدنیہ کریم پارک، راوی روڈ لاہور

مولانا نعیم الدین صاحب مدظلہم طابع و ناشر نے پرنٹ یارڈ پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "الحامد" لاہور سے شائع کیا

فہرست مضامین

اداریہ

دینی حلقوں میں انتشار کی وجوہات......حل کیا ہے؟

مدیر کے قلم سے

عوام کی ایک تعداد اب بھی ایسی ہے، جو اپنے مسائل کے حل اور رہنمائی کے لیے دینی مدارس اور اہل علم کی طرف رجوع کرتی ہے۔اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ہر ایک صاحب علم وسجادہ نشین کا اپنا ایک حلقہ ہے جو بوجہ عقیدت یا بوقت ضرورت ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔لیکن ہر ایک حلقہ، دوسرے حلقے سے منقطع ہے۔الگ الگ گروہ ہیں اور ہر ایک قائد نے دوسرے قائد سے الگ اپنا دائرہ کھینچ رکھا ہے۔اور ان تمام دائروں میں جو قدریں مشترک ہیں ان میں سے ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لینا، ہر اُڑتی خبر کی تشہیر اور ہر ایک زبان جو کسی بھی حلقے کے متعلق غلط فہمیاں پھیلا رہی ہے — اس زبان کی خبر کو بمنزلہ وحی قرار دینا۔الا من شاء اللہ۔

بلاشبہ کچھ حضرات — جن کی تعداد بہت ہی تھوڑی رہ گئی ہے — اس بیماری سے محفوظ ہیں ورگرنہ تو یہ ایک بلا ہے جس نے ہر طرف تباہی مچا رکھی ہے۔دینی حلقے خود ایک دوسرے سے دور سے دور تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ایک ہی مسلک ومشرب کے علماء ومشائخ، ایک ہی مدرسے کے پڑھے ہوئے، ہم سبق اور ہم استاد اور حتیٰ کہ ایک ہی چھت تلے پڑھانے والے بھی ایک دوسرے سے بدظن ہیں۔

اس وبا سے آج کوئی حلقہ بھی محفوظ نہیں ہے خود اہل علم اس وبا سے کم متاثر اور ان کے حاشیہ نشین اس معاملے میں صدر نشین ہیں اور اس وبا میں مبتلا افراد ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر اس ''کارِخیر'' میں شریک ہے۔عالم تاریک اور اخلاقی اقدار ماتم کناں ہیں۔کوئی ہے جو اس وبا کو دور کرنے کی تدبیر کرے اور کوئی ہے جو اس روگ کا مداوا کرے؟

اس مرض کا واویلا کرنے کے بعد ہمیں اس کا علاج بھی سوچنا ہے کہ نقل وعقل نے اس وبا سے بچنے کی کیا تدابیر بتائی ہیں؟

سو پہلی تدبیر تو یہ ہے کہ ہم طے کر لیں کہ کوئی حلقہ خواہ ہمارا موافق ہو یا مخالف، دوست ہو کہ دشمن، اپنا ہو کہ پرایا، جب بھی اس کے متعلق کوئی بری خبر ملے گی تو ہم ہمیشہ اس حلقے کے قائدین اور ذمہ دار افراد سے اس خبر کی تحقیق کریں گے۔خبر اگر

صحیح ہو گی تو اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر خبر غلط ہو گی تو اس کی تشہیر کرنے والے کی حوصلہ شکنی یا اس کے لیے کوئی نہ کوئی سزا تجویز کریں گے۔ ایسے افراد کو اپنے اداروں سے خارج کر دیں گے اور یا پھر ایسے افراد کو ایسی زجر و توبیخ کریں گے کہ آئندہ ان کو ایسی غلط فہمیاں پھیلانے کی ہمت نہ ہو اور یا پھر ایسے مشائخ کی صحبت اور ان سے تعلق کی نصیحت کریں گے، جن مشائخ کے ہاں اصلاح نفس کا خاص اہتمام ہوتا ہو۔

شریر افراد قصداً اور مخلص افراد کبھی غیر ارادی طور پر اس وبا کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ لیکن دونوں صورتوں میں خمیازہ یہ بھگتنا پڑتا ہے کہ دینی ماحول متاثر ہوتا ہے اور جگ ہنسائی کا موقع ایسے افراد کو ملتا ہے، جو پہلے ہی سے ایسے مواقع کی تاک میں ہوتے ہیں۔ شیطان کیسے ٹھنڈے پیٹوں یہ برداشت کرسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام لیوا اور مخلص افراد روزانہ اس کے جتھے سے لوگوں کو نکال کر اللہ تعالیٰ کی راہ پر ڈالتے رہیں۔ اسے یہ کیسے گوارا ہے کہ اس کا گروہ کمزور ہوتا چلا جائے اس لیے وہ اہل حق کے متعلق غلط فہمیاں اور ان کی تحریروں میں ایسی باتیں ملاتا ہے جس سے اہل حق آپس میں لڑ پڑیں اور ان کی قوت منتشر ہو جائے۔

علامہ خیر الدین ابوالبرکات سید نعمان آلوسی بن سید محمود آفندی رحمہم اللہ تعالیٰ صاحب روح المعانی المتوفی ۱۳۱۷ھ اپنے علم کے حوالے سے اس وبا کا رونا روتے ہیں اور تحریر فرماتے ہیں کہ

وقد بلغني ان الامام مصطفى القرماني الحنفي شرح مقدمة أبي الليث السمرقندي شرحاً عظيما،ودخل به مصر ليطلع عليه علماء مذهبه، فدسَّ فيه بعض الحسدة في باب (آداب الخلاء): ولا يستقبل الشمس والقمر، لأن ابراهيم الخليل كان يعبدهما ؛ فأفتوا بقتله، فخرج في الليل من مصر هارباً، ولم يرجع اليها. (جلاء العينين، بمحاكمة الاحمدين، البحث الخامس، الفصل الرابع، ترجمه: ابی بکر بن العربی ،ص:١٦٤)

امام مصطفیٰ کرمانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے حنفی فقہ کی مشہور کتاب ''مقدمہ ابی اللیث'' کی شرح تحریر فرمائی اور شرح بھی اتنی عظیم الشان تھی کہ فقہ حنفی کا صحیح معنیٰ، میں تعارف تھا۔ وہ اسے مصر لے کر گئے تا کہ وہاں کے علماء کو فقہ حنفی سے متعلق مزید معلومات فراہم کی جاسکیں لیکن جن لوگوں کو امام مصطفیٰ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ سے حسد تھا انہوں نے کارنامہ یہ انجام دیا ''شرح مقدمہ ابی اللیث'' کا نسخہ لیا اور اس کے باب آداب الخلا میں کاتبوں سے کہہ کر اس عبارت کا اضافہ کروادیا۔ ''اور بیت الخلا میں بیٹھنے والا شخص سورج اور چاند کی طرف رخ نہ کرے کیونکہ سورج اور چاند (دونوں خدا ہیں اور) ان دونوں کی عبادت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ وعلیٰ نبینا الصلاۃ والسلام کیا کرتے تھے۔'' حاسدوں نے اس جعلی اور جھوٹی عبارت کا اضافہ، کاتبوں کے ذریعے سے

کرا دیا۔ظاہر ہے کہ یہ کفر یہ عبارت تھی ۔علماء مصر نے
اس عبارت کو پڑھ کر شیخ مصطفیٰ کرمانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ
کے ارتداد اور ان کے قتل کا فتویٰ جاری کردیا۔شیخ کو بروقت
اطلاع مل گئی اور وہ راتوں رات مصر چھوڑ کر فرار ہوئے اور
پھر عمر بھر مصر کا رُخ نہ کیا۔

اب ہمارے دور میں کتابوں میں جھوٹی عبارات شامل کرنا تو کچھ دشوار ہے لیکن اب بھی مکار لوگ کسی پر کیچڑ اچھالنے کے لیے کسی ایسی کتاب کا حوالہ دے دیں گے جس کا وجود ہی نایاب ہے یا پھر یہ مکاری کریں گے کہ کسی ایسی کتاب کا حوالہ دے دیں گے جو کسی اور ملک میں چھپی ہو اور اس کا حصول سہل نہ ہو کہ جلدی جلدی نہ وہ کتاب ملے اور نہ اس حوالے کی تصدیق و تردید ہو سکے اور یا پھر محولہ کتاب مل بھی جائے گی حوالہ بھی درست ہوگا لیکن مصنف نے جو کچھ بھی لکھا ہوگا وہ اس مفہوم سے کوسوں دور ہوگا، جس مفہوم کو بنیاد بنا کر یہ ''فتنہ گر'' ایک فتنے کو ہوا دے رہا ہوگا۔

یہی کچھ حال زبان کا بھی ہے۔ کہنے والے نے کچھ کہا، نقل کرنے والے نے کچھ اور سُنا پھر نقل کرتے ہوئے الفاظ تبدیل ہوئے اور جس بزرگ کے سامنے یہ تمام کتھا بیان ہو رہی ہے وہ اُسے کچھ سے کچھ سمجھے۔کیا یہ مناسب نہیں کہ وہ بزرگ بجائے اپنے حلقے اور اطلاع دینے والے پر اعتماد کرنے کے، اصل فرد سے رابطہ کر کے پھر بات کو آگے بڑھاتے۔

جب سے اس احتیاط کا دامن چھوٹا ہے تب سے دینی حلقوں میں انتشار پھیلا ہے، جماعتیں گروہ در گروہ منقسم ہوئی ہیں اور اہل حق آپس میں ٹکرا کر اپنی ہی صلاحیتیں اور قوتوں کو پاش پاش کر رہے ہیں۔

اللّٰھم انی اعوذبك من الشقاق والنفاق وسوء الاخلاق (اے میرے اللہ میں آپس میں سخت اختلاف برپا کرنے، منافقت اور برے اخلاق سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔)
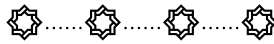
آداب تلاوت قرآن مجید

مفتی محمد سعید خان

(۱) ہر عاقل و بالغ مسلمان مرد اور عورت کیلئے اتنا قرآن کریم کو زبانی یاد کرنا فرض عین ہے جس سے نماز ہو جائے۔

(۲) ہر عاقل و بالغ مسلمان مرد اور عورت کیلئے سورۃ فاتحہ اور اس کے علاوہ اتنا قرآن کریم زبانی یاد کرنا واجب ہے جس کی تلاوت سے نماز ہو جائے۔

(۳) قرآن کریم کو چھونے کیلئے باوضو ہونا ضروری ہے۔لیکن تلاوت کی کیسٹوں کو بے وضو چھونا بھی جائز ہے۔

(۴) تلاوت سے پہلے مسواک یا ٹوتھ پیسٹ سے منہ کو صاف کر لینا مستحب ہے۔

(۵) اگر کوئی شخص زبانی، بغیر وضو کے تلاوت کرنا چاہے تو یہ جائز ہے بشرطیکہ وہ قرآن کریم کو چھوئے نہیں۔البتہ زبانی تلاوت کرتے ہوئے بھی باوضو ہونا مستحب ہے۔

(۶) قرآن کریم زبانی پڑھنے سے دیکھ کر پڑھنا افضل ہے کیونکہ اس میں زبان اور نظر دونوں کی عبادت کا ثواب ہے۔

(۷) تلاوت کیلئے کپڑوں کا پاک ہونا شرط نہیں البتہ قرآن کریم کے ادب و احترام میں کپڑوں کا پاک ہونا اور خوشبو کا استعمال کرنا زیادہ ثواب کی بات ہے۔

(۸) تلاوت کرتے ہوئے کسی سمت کی پابندی ضروری نہیں البتہ قبلہ رخ ہونا زیادہ ادب اور ثواب کا باعث ہے۔

(۹) تلاوت شروع کرنے سے پہلے تعوذ یعنی '' اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم o '' کا پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔

(۱۰) تلاوت شروع کرنے پہلے تعوذ کے بعد تسمیہ یعنی ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِo '' کا پڑھنا بھی سنت مؤکدہ ہے۔

(۱۱) دوران تلاوت جب ایک سورت مکمل ہو جائے تو دوسری سورت شروع کرنے سے پہلے تعوذ نہ پڑھا جائے لیکن تسمیہ کو یعنی ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِo '' کو پڑھنا چاہیے اور اگر دوران تلاوت سورۂ توبہ آ جائے تو پھر اس مقام پر رُک کر تسمیہ بھی نہ پڑھی جائے۔

(۱۲) اگر کوئی شخص تلاوت کا آغاز سورہ توبہ سے کر رہا ہے تو تلاوت سے پہلے تعوذ اور تسمیہ دونوں پڑھنے چاہئیں۔

(۱۳) اگر کوئی شخص سورۂ توبہ سے پہلے سورۃ انفال سے تلاوت کرتا چلا آ رہا ہے تو اب سورۂ توبہ پر رک کر تعوذ اور تسمیہ پڑھنا درست نہیں بلکہ سورۂ انفال کو مکمل کر کے سورۂ توبہ کو پڑھتا رہے۔

(۱۴) اگر کوئی شخص تلاوت کرتے ہوئے قرآن کریم کا تلفظ زبان سے نہ کرے اور ہونٹ بند کر کے صرف دل ہی دل میں نظر سے

پڑھتا رہے تو یہ تلاوت نہ ہوگی۔ تلاوت کیلئے زبان اور ہونٹوں سے تلفظ کرنا اور انہیں حرکت دینا فرض ہے۔

(۱۵) تلاوت اونچی آواز سے کرنا مستحب اور بہتر ہے مگر کسی شخص کو ریا کاری کا خدشہ ہو یا تلاوت بلند آواز سے کرنے کی وجہ سے کسی کی نیند خراب ہوتی ہو یا کسی مریض کو تکلیف پہنچتی ہو یا اس بلند آواز کی وجہ سے لوگ پریشان ہوتے ہوں تو پھر تلاوت اونچی آواز سے کرنا حرام اور آواز کو آہستہ رکھنا فرض ہے۔ ان تمام صورتوں میں بلند آواز سے تلاوت کرنے والا گنہگار ہوگا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری تلاوت تو اپنے رب سے سرگوشیاں کرنا ہے سو تم قرأت میں نہ تو ایک دوسرے کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ ہی کوئی شخص دوسرے شخص کے مقابلے میں اپنی آواز کو بلند کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آج کل مختلف مقامات مثلاً دکانوں، مکانوں یا مساجد وغیرہ میں تلاوت قرآن کی کیسٹیں جو اونچی آواز میں لگادی جاتی ہیں تو یہ کام درست نہیں ہے۔ اس فعل سے بچنا ضروری ہے۔ انہیں خدشات کے پیش نظر بعض فقہائے کرام رحمہم اللہ نے تلاوت آہستہ آواز میں کرنے کو بہتر اور افضل لکھا ہے۔

(۱۶) جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں وہاں اونچی آواز سے تلاوت کرنا حرام ہے تلاوت کرنے والا شخص گناہ گار ہوگا جو لوگ اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس وقت تلاوت نہیں سن سکتے ان پر گناہ نہیں ہے۔

(۱۷) دوران تلاوت جن آیات میں جہنم کا ذکر آئے تو وہاں رُک کر اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا، جب جنت کا ذکر آئے تو وہاں رک کر اس میں داخلے کیلئے دعا مانگنا، جب اللہ تعالیٰ کی تسبیح کی آیات آئیں تو وہاں رک کر اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرنا یا جن آیات کے بعد ان کے جوابات مختلف احادیث وروایات میں آئے ہیں انہیں پڑھنا مستحب ہے۔

(۱۸) قرآن کریم میں جن چودہ مقامات پر لفظ ''السجدۃ'' تحریر ہے ان آیات کی تلاوت کے بعد سجدہ کرنا واجب ہے۔

(۱۹) سجدۂ تلاوت کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کھڑا ہو کر بغیر ہاتھ اٹھائے اللہ اکبر کہے اور سجدہ کرے اور سجدے میں تین مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الاَعْلٰیo کہے اور پھر یہ دعاء پڑھے۔

اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِیْ بِهَا عِنْدَكَ اَجْرًا وَضَعْ عَنِّیْ بِهَا وِزْرًا وَاجْعَلْهَا لِیْ عِنْدَكَ ذُخْرًا وَ تَقَبَّلْهَا مِنِّیْ كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوٗدَ.

ترجمہ: ''اے اللہ میرے اس سجدے کا ثواب اپنے پاس تحریر فرمالیجئے اور مجھ پر جو گناہ کا بوجھ ہے اس سجدہ کی وجہ سے اسے ہٹادیجئے اور اس سجدے کو میری آخرت کیلئے اپنے پاس ثواب کا ذخیرہ بنادیجئے اور اس سجدے کو میری طرف سے ایسے ہی قبول فرمالیجئے جیسے کہ آپ نے اپنے بندے حضرت داؤد علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام کے سجدے کو قبول فرمالیا تھا۔''

اور پھر اللہ اکبر کہہ کر کھڑا ہو جائے۔

(۲۰) جب کوئی شخص آیت سجدہ اصل قاری کی بجائے اس کی ریکارڈ آواز میں سنے یا کیسٹ میں سنے تو اس پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہے۔

(۲۱) جب قرآن کریم مکمل ہو جائے تو آخری سورۃ کے بعد قرآن کریم دوبارہ شروع کر کے سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات واولئک هم المفلحون تک تلاوت کر لینا مستحب ہے۔

(۲۲) موسم گرما میں صبح اشراق کے بعد قرآن کریم کو مکمل کرنا اور موسم سرما میں مغرب کے بعد قرآن کریم کا مکمل کرنا افضل ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص رات کے ابتدائی حصے میں قرآن ختم کرے تو وہ فرشتے اس رات کی صبح تک اور اگر وہ دن کے ابتدائی حصے میں قرآن ختم کرے تو فرشتے اس دن کی شام تک اس بندے کیلئے اللہ تعالیٰ سے رحمت کی دعا مانگتے رہتے ہیں۔ چونکہ گرمیوں میں دن طویل اور سردیوں میں راتیں طویل ہوتی ہیں اس لئے ختم قرآن کے واسطے یہ اوقات مستحب ہیں تا کہ فرشتوں کی دعاء میں قرآن کریم پڑھنے والے کو زیادہ حصہ ملے۔

(۲۳) جتنی بھی تلاوت کرنی ہو اُسے شروع کرنے کے بعد مکمل کرنے تک کے دوران، کسی اور کام میں مشغول نہ ہونا بہتر ہے۔

(۲۴) سال میں دو مرتبہ مکمل قرآن کریم کی تلاوت سنت مؤکدہ ہے۔

(۲۵) قرآن کریم کو پڑھ کر اس طرح بھلا دینا کہ دیکھ کر بھی تلاوت نہ کر سکے گناہ کبیرہ ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص قرآن کریم کو پڑھ کر بھلا دے وہ قیامت میں اللہ کے سامنے اس حال میں پیش ہوگا کہ اُسے کوڑھ کا مرض ہو گیا ہوگا۔

(۲۶) سال بھر میں وہ راتیں جن میں جاگ کر عبادت کرنا مستحب ہے جیسے شب برأت یا لیلۃ القدر ان میں قرآن کریم کی تلاوت نوافل سے بہتر ہے اور نوافل ہی میں تلاوت کرنا سب سے افضل ہے۔

(۲۷) تلاوت کرنے اور نوافل پڑھنے سے زیادہ ثواب تلاوت سننے میں ہے لیکن اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تلاوت ترک کر کے صرف سننے ہی کو کافی سمجھا جائے بلکہ تلاوت کرنے کا خود ایک مستقل اجر و ثواب ہے۔

(۲۸) قرآن کریم کی کسی آیت کو موسیقی کے ساتھ گانا کفر ہے۔

(۲۹) کسی کافر کو اس امید پر قرآن پڑھانا درست ہے کہ وہ اسلام قبول کر لے گا یا اسے ہدایت کی توفیق مل جائے گی لیکن اگر کسی کافر نے قرآن کریم کو چھونا ہو تو یہ ضروری ہے کہ وہ غسل کرے۔

(۳۰) عورتوں کا کسی نابینا غیر محرم مرد سے قرآن کریم پڑھنے سے بہتر ہے کہ وہ کسی عورت سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کریں۔

(۳۱) موجودہ زمانے میں تعلیم قرآن کریم پر معلم کا اجرت لینا تمام فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔

مندرجہ بالا تمام مسائل کے حوالہ جات کیلئے ملاحظہ ہو:۔

(۱) رد المحتار۔ ج:۲،ص:۲۶۸۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب صفۃ الصلوٰۃ۔ فروع فی القرأۃ خارج الصلوۃ۔ (۲) الفتاویٰ التاتارخانیہ۔ ج:۱،ص۵۰۰ کتاب الصلوٰۃ الفرائض۔ فصل فی القراءۃ۔ الفصل السادس عشر۔ (۳) الفتاویٰ الهندیہ۔ ج:۵، ص:۳۱۵۔ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الرابع فی الصلوٰۃ والتسبیح وقراءۃ القرآن۔ (۴) حلبی کبیر۔ ص:۴۹۳۔ تتمات فیما یکرہ من القرآن فی الصلوۃ مالا یکرہ۔ (۵) اعلاء السنن۔ ج:۴،ص:۱۵۷۔ ابواب القراءۃ۔ باب ماجاء فی بعض آداب التلاوۃ۔

قرأت اور رسم الخط

مفتی محمد سعید خان

جناب رسول اللہ ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابی بن کعب، حضرت زبیر، حضرت حنظلہ بن ربیع اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم وغیرہ کو بلوا کر قرآن کریم لکھوا دیتے تھے ان تمام کاتبین میں صرف حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہی کو یہ شرف حاصل رہا ہے کہ انہوں نے تقریباً دس برس تک قرآن کریم اور جناب رسول اللہ ﷺ کی نجی خط و کتابت کی ہے۔ قرآن کریم کے لکھنے کی صورت یہ تھی کہ اسے سفید پتھروں کی ترشی ہوئی سلوں، لکڑی کی تختیوں، اور سفید چمڑے پر لکھ لیا جاتا تھا یہاں تک کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں پورا قرآن کریم لکھ لیا گیا اور وہی اب تک محفوظ چلا آتا ہے۔ خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے شدید اصرار پر قرآن کریم کا وہ حصہ جو جناب رسول اللہ ﷺ نے خود لکھوایا تھا اور مختلف چیزوں پر مختلف لوگوں کے پاس تحریر شدہ تھا، یہ تمام تحریریں ایک جگہ جمع کرنے کا فیصلہ کیا گیا حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے یہ اہم ذمہ داری حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو سونپی اور انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کے ہمراہ ان تمام تحریرات کو جمع کیا اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے پورا قرآن ان تختیوں سے املا کرایا جن سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے لکھا۔

تقریباً ایک برس میں یہ عظیم الشان کام پایۂ تکمیل تک پہنچا اس نسخے کا نام ''صُحُفِ بَکْرِیَة'' تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہے اور ان کی شہادت کے بعد یہ ''صحف'' ام المومنین سیدہ حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما کے پاس محفوظ رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو اسلام دور دور تک پھیل چکا تھا اور لاکھوں افراد مدینہ طیبہ سے ہزارہا میل کے فاصلے پر قرآن کریم پڑھتے تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین سیدنا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے اصرار کیا کہ وہ سرکاری طور پر قرآن لکھوا کر مختلف مقامات پر پہنچوائیں تاکہ لوگوں کو قرآن کریم کی صحیح تعلیم دی جا سکے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (جن میں حضرت ابی بن کعب، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت سعید بن العاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث رضی اللہ عنہم شامل تھے) پر مشتمل ایک جماعت حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی امارت میں

مقرر کی اور انہیں حکم دیا کہ قرآن کریم کے کئی ایک نسخے لکھیں اور کتابت میں کہیں بھی اختلاف ہوتو اسے قریش کی لغت کے مطابق لکھا جائے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ کتابت بہت اہتمام سے کروائی یہاں تک کہ دوران کتابت جب یہ حضرات قرآن کریم کے لفظ ''التابوت'' پر پہنچے تو جو نسخے محفوظ تھے ان کو چونکہ کثرت سے پڑھا گیا تھا اس لئے وہاں ''التابوت'' کی آخری ''ت'' مٹ گئی تھی اس لئے اب یہ اختلاف ہوا کہ ''ت'' کیسے لکھی جائے ''ت'' یا ''ۃ'' پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ ''ت'' لکھنے کا حکم فرمایا۔حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی املاء پر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے آٹھ ایسے نسخے لکھے جن میں رسم الخط کا معمولی اختلاف تھا اور یہ اختلاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس لئے رکھا کہ ان تمام قرأتوں کو پڑھا جا سکے جو جناب رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمائی گئی تھیں۔حضرت عثمان نے ''صُحُفِ بَکْرِیَّہ'' ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو واپس بھجوا دیئے اور ان آٹھ نسخوں میں سے ایک نسخہ اپنے پاس محفوظ فرما لیا، اس نسخے کو ''امام'' کہتے تھے۔دوسرا نسخہ مسجد نبوی (علیٰ منورھا الف الف التحیہ والثنا) میں رکھوا دیا۔تیسرا نسخہ مکہ مکرمہ روانہ کیا گیا چوتھا نسخہ کوفہ، پانچواں نسخہ بصرہ، چھٹا نسخہ شام، ساتواں نسخہ بحرین اور آٹھواں نسخہ یمن بھجوایا گیا تا کہ لوگ اپنے اپنے مصاحف کو ان نسخوں سے ملا کر صحیح تعلیم اور قرأت حاصل کریں۔پھر آپ نے صرف اسی پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ ہر نسخے کے ساتھ پڑھانے والے معلم بھی مقرر فرمائے کہ کتاب کی سمجھ استاد کے بغیر ناممکن ہے۔مدینہ طیبہ میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو تعلیم کیلئے مقرر کیا گیا مکہ مکرمہ (زادھا اللّٰہ شرفاو تعظیما) میں حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ، کوفہ میں حضرت عبدالرحمٰن سلمی، بصرہ میں حضرت عامر بن فیض اور شام میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم کیلئے یہ احکامات جاری کئے گئے کہ وہ لوگوں کو سرکاری طور پر قرآن کریم کی تعلیم دیں۔دس ہزار سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں یہ تمام مصاحف تحریر کئے گئے اور مختلف شہروں میں بھجوائے گئے۔جناب رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے دور میں مستقل جماعت ایسی تیار فرما دی تھی جو '' قرّاء'' کہلاتے تھے اور ان میں سے سات '' قرّاء'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے تھے جن کی قرأت کو ہر زمانے میں مسلمانوں نے پڑھا اور انہی کی قرأتیں آج تک چل رہی ہیں۔یہ سات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ ہیں۔

(۱) حضرت عثمان (۲) حضرت علی (۳) حضرت ابی بن کعب (۴) حضرت زید بن ثابت (۵) حضرت عبداللہ بن مسعود (۶) حضرت ابوالدرداء (۷) حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہم اجمعین۔

جناب رسول اللہ ﷺ سے لیکر آج ہمارے اس دور تک امت کے پاس دس قرأتیں ایسی ہیں جنہیں ہم بآسانی پڑھ سکتے ہیں اور یہ تواتر اور شہرت کے ساتھ جناب رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ان کا انکار کرنا جہالت کی دلیل ہے اور باوجود علم کے نہ ماننا کفر پر مبنی ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آخری دور اور تابعین رحمھم اللہ کے پورے دور میں پھر ایسی مقدس ہستیاں عالم رنگ و بو میں آئیں جنہوں نے اپنی زندگیاں اللہ تعالیٰ کے اس پاک کلام کیلئے وقف کر دیں اور ''قرّاء عشرہ'' کے نام سے مشہور ہوئے۔

(۱) امام نافع رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ نے ستر سے زیادہ تابعین رحمۃ اللہ علیہم سے قرآن کریم کو پڑھا اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابو ہریرہ سے اور انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم سے قرأت حاصل کی۔ آپ کے دوراوی ہیں (الف) قالون (ب) ورش رحمۃ اللہ علیہ۔ امام نافع رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت اب تک اسپین، الجزائر، فرانس اور مراکش وغیرہ میں پڑھی جاتی ہے اور انہی کی قرأت کے مطابق قرآن کریم کے چھپے ہوئے نسخے بآسانی دستیاب ہیں۔

(۲) حضرت عبداللہ بن کثیر دارمی رحمۃ اللہ علیہ جو مکہ مکرمہ میں قرأۃ کے امام تھے اور انہوں نے حضرت مجاہد سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے اور انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم سے قرأت کی تعلیم حاصل کی ابن کثیر کے دوراوی ہیں (الف) بزی اور (ب) قنبل۔

(۳) حضرت ابوعمروالبصری رحمۃ اللہ علیہ، آپ نے حضرت مجاہد اور حضرت سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے اور انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم سے قرأت اخذ کی ان کے دوراوی ہیں۔ (الف) ابوعمر ودوری (ب) ابوشعیب سوسی۔ سنا ہے کہ حضرت ابوعمرو رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت اب بھی سوڈان وغیرہ میں رائج ہے۔

(۴) حضرت عبداللہ یحصبی رحمۃ اللہ علیہ جو ابن عامر شامی کہلاتے ہیں انہوں نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قرأت کی تعلیم حاصل کی، ان کے اپنے دوشاگرد بہت مشہور ہوئے۔ (الف) ہشام (ب) ابن ذکوان۔

(۵) امام عاصم رحمۃ اللہ علیہ انہوں نے زر بن حبیش سے اور انہوں نے حضرت اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے قرأت پڑھی۔ ان کے دوراوی ہیں (الف) شعبہ بن عیاش (ب) حفص بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ، یہ وہی امام حفص ہیں جن کی قرأت آج تقریباً تمام دنیا میں پڑھی، لکھی اور سنی جارہی ہے۔

(۶) حضرت حمزہ بن حبیب الکوفی، ان کا سلسلہ قرأت حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے جاملتا ہے۔ ان کے دوراوی ہیں۔ (الف) خلف (ب) خلاّد۔

(۷) حضرت ابوالحسن الکسائی رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کے دوراوی ہیں (الف) ابوالحارث (ب) دوری، جن کا نام امام ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ کے راویوں میں گزرا ہے۔

(۸) حضرت ابوجعفر یزید رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کی سند قرأت بھی حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطے سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے جاملتی ہے۔ ان کے بھی دوراوی ہیں (الف) ابن وردان (ب) ابن جماذ۔

(۹) حضرت یعقوب بن اسحاق الحضرمی رحمۃ اللہ علیہ آپ کی سند حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے جاملتی ہے۔

ان کے دوراوی تھے (الف) رویس (ب) روح

(۱۰) آخری امام قرأت حضرت خلف بن ہشام رحمۃ اللہ علیہ ہیں ان کے بھی اگرچہ دوراوی ہیں مگران دونوں کی روایت چنداں مختلف نہیں اس لئے ان کے نام نہیں لکھ گئے اس اعتبار سے جناب رسول اللہ ﷺ سے لیکر ہم تک قرآن کریم پڑھنے کی سات متواتر اور تین مشہور قرأتیں ہیں جن کے الفااور طرز اداءالفاظ بھی متواتر ومشہور ہیں۔

یہاں پراس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان تمام ائمہ قرأت سے ہزاروں افراد نے علم حاصل کیا ہوگا مگر ہر ایک کے ان دوراویوں کا زیادہ اعتبار ہے جن کے ناموں کی صراحت کی گئی ہے۔فرحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جوقرآن کریم تحریر فرمائے تھے اس رسم الخط پران کا اجماع تھا اور اُمت ہر دور میں اس پر متفق رہی اور جناب رسول اللہ ﷺ کی تائید بھی اس رسم الخط کو حاصل تھی اس لئے اسی رسم الخط کو باقی رکھنا ضروری ہے اوراس کی مخالفت جائز نہیں۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس بات کا خاص خیال رکھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک ہی لفظ کوقرآن کریم میں جب وہ کسی ایک مقام پر آیا تو اسے کسی اور طریقہ سے لکھا اور کسی دوسرے مقام پر آیا تو اسے کسی دوسرے طریقہ سے لکھا۔تو ان کی یہ کاوش رسم الخط کی حفاظت کیلئے کچھ عبث نہ تھی۔ بلکہ انہوں نے وہی رسم الخط تحریر فرمایا جس میں قرآن کریم کی تلاوت نازل ہونے والی تمام قرأتوں میں کی جاسکتی ہے مثلا جب ہم سورہ فاتحہ کی تلاوت کرتے اوراس میں پڑھتے ہیں ''مٰلک یوم الدین'' تو آیت کریمہ کے ''م'' کو کھڑی زبر کے ساتھ کیوں لکھتے ہیں؟ ''م'' کے بعد الف بڑھا کر ''مالک'' کیوں نہیں لکھتے؟ اس لئے کہ اس لفظ کو دوطرح پڑھنا ثابت ہے جناب رسول اللہ ﷺ نے اسے ''مٰلک'' بھی پڑھا اور ''مَلِکِ'' پڑھا ہے اگر ہم اسے ''مالك'' لکھ کر ''م'' کے بعد ''الف'' کا اضافہ کردیں تو متواتر قرآت جس میں اس لفظ ''مَلِکِ'' پڑھا گیا ہے اس کیسے پڑھیں گے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے ''مٰلک'' اس رسم الخط اس لئے لکھوایا تھا کہ دونوں قرأتیں اس میں پڑھی جاسکیں۔

اس رسم الخط کی حفاظت کیوں ضروری اور واجب ہے اس کی ایک دوسری مثال بھی ملاحظہ ہو۔سورۂ انعام میں ایک لفظ آیا ہے ''بِالْغَدٰوةِ'' اسے ہم ''واوَ'' کے بغیر پڑھتے ہیں اور جوتلفظ ہم کرتے ہیں وہ ہے ''بِالْغَدَاةِ'' پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ''غ'' کے بعد ''وٗ'' پر کھڑی زبر ڈال کر اسے یوں پڑھتے ہیں اور لکھتے ''وٗ'' کے ساتھ ہیں؟ اس لئے کہ امام حفص رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق تو اسی طرح پڑھا گیا ہے مگر ابن عامر شامی رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت میں اسے ''بِالْغُدْوَةِ'' پڑھا گیا ہے اور یہ بھی مسلسل ومتواتر قرأت ہے۔اب اگر ہم اس لفظ کو بغیر ''واوَ'' کے تحریر کردیں تو ایک متواتر قرأت کیسے پڑھی جائے گی؟ اس لئے اس رسم الخط کی حفاظت اور اتباع واجب ہے جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اجماع کیا تھا۔

قرآن کریم کا یہ نسخہ جواس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اس میں اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ یہ حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے لکھے گئے مصحف کے رسم الخط کے مطابق ہو۔ ہر ہر کلمہ میں حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ رسم الخط وہی رہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تحریر کے مطابق ہو۔ حضرت مولانا حافظ قاری رحیم بخش صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جو اس صدی میں قرأت کے مجدد، جزری دوراں اور اپنے فن میں امام وقت تھے انہوں نے اس نسخے کو حرفاً حرفاً ملاحظہ فرمایا تھا اور ائمہ قرأت نے اپنی کتب میں رسم الخط کے بارے میں جو تصریحات کی ہیں ان کی انہوں نے اس نسخے کے رسم الخط میں رعایت فرمائی تھی اور جہاں بھی اختلاف کی صورت پیش آئی وہاں انہوں نے حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ کی طرف رجوع فرمایا اور انہیں کے ارشاد کے مطابق حضرت محمد غوث بن ناصر الدین ارکاٹی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''نثر المرجان'' میں فیصلہ کن قول تحریر فرمایا اور اسی کو ترجیح دی۔

قرآنی آیات تعداد کے اعتبار سے سات طرح تقسیم کی گئی ہیں اس میں دو طرح کا شمار مدینہ منورہ کا ہے تیسرا مکہ مکرمہ کا چوتھا بصرہ پانچواں دمشق کا چھٹا حمص کا اور ساتواں شمار کوفی ہے۔ اس نسخے میں کوفی شمار کے اعتبار سے آیات پر نمبر لگائے گئے ہیں اور اس طرح آیات کی کل تعداد چھ ہزار دو سو چھتیس (۶۲۳۶) ہے۔ چونکہ اس نسخے میں اعراب بھی امام حفص کوفی المتوفی ۱۸۰ھ رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت کے مطابق ہیں اس لئے شمار بھی اہل کوفہ ہی کا لیا گیا ہے۔ رکوع کی علامات وہ ہیں جنہیں علماء وفقہا ماوراء النہر اور مشائخ حنفیہ نے بخارا میں مقرر کیا تھا۔ صرف ایک مقام پر رکوع کی علامت تبدیل کی گی ہے اور وہ سورہ واقعہ کا پہلا رکوع ہے کہ اس کی علامت ''ثلۃ من الاخرین'' پر لکھی گئی ہے۔ ہر رکوع پر تین ہندسے لکھے ہوئے ملیں گے ان میں سے اوپر والا ہندسہ سورۃ کے رکوع کا نمبر ظاہر کرتا ہے۔ درمیان کا ہندسہ یہ بتاتا ہے کہ پچھلے رکوع سے لیکر اس رکوع تک کے درمیان میں کتنی آیات ہیں اور آخری نیچے والا نمبر ظاہر کرتا ہے کہ اس پارے کے اب تک کتنے رکوع گزر چکے ہیں۔ مثلاً سورۂ واقعہ کے پہلے رکوع پر آپ ایک نشان دیکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نمبرا سورۃ واقعہ کا پہلا رکوع ہے نمبر ۳۹ کا مطلب یہ ہے کہ سورۃ کے شروع سے لیکر اب تک ۳۹ آیات گزر چکی ہیں۔ اور نمبر ۱۴ کا یہ مطلب یہ ہے کہ اس پارے کا رکوع نمبر ۱۴ ہے۔

دعا ہے کہ جن حضرات نے اس نسخے کی تصحیح کی، جنہوں نے محنت کی، اپنے اوقات عزیز کو اس مبارک کام میں صرف کیا، جنہوں نے اس کی اشاعت میں حصہ لیا اور جو حضرات اس نیکی کا سبب بنے یا جس کسی نے بھی اس کار خیر میں حصہ لیا، اللہ تعالیٰ اسے سب کی طرف سے قبول فرمائے۔ اپنی رضا اور خوشی سے نوازتا رہے۔ ان کی زندگیوں کو سنت کے رنگ میں سمودے اور اپنے اپنے وقت پر تزکیہ واحسان اور دولت یقین کے ساتھ خاتمہ بالخیر فرمائے۔

اس مضمون کے حوالہ جات کیلئے ملاحظہ ہو۔ (۱) الاتقان (۲) کتاب النثر (۳) البرھان
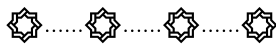
درس قرآن مجید

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ. (۳۰)

اور وہ واقعہ قابل ذکر ہے جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ یقیناً میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کیا آپ زمین میں ایسے شخص کو پیدا کریں گے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے یعنی اس کی اولاد، اور ہم آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح کرتے اور آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں، خدائے تعالیٰ نے فرمایا میں اس بات کو جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتے۔ (۳۰)

تفسیر: اور وہ واقعہ قابل ذکر ہے جب اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ یقیناً میں زمین پر ایک نائب بنانے والا ہوں۔ اس پر فرشتوں نے عرض کیا کیا آپ زمین پر ایسے لوگوں کو پیدا کریں گے جو اس میں فساد کریں گے اور خون ریزی کے مرتکب ہوں گے۔ حالانکہ ہم آپ کی حمد و ثناء کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور آپ کی تنـــزیـہ اور تقدیس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ اس کے پیدا کرنے کی جو حکمت و مصلحت میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین میں آدم علیہ السلام کو پیدا کرنا چاہا اور ملائکہ اور جنات کی موجودگی کے باوجود ایک ایسی مخلوق کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا۔ جو دونوں قسم کی استعداد سے متصف ہو اور اس کی طبیعت صلاح اور فساد دونوں کی جانب مائل ہونے والی ہو، کیونکہ ملائکہ میں تو نافرمانی اور فساد کی صلاحیت ہی نہ تھی اور جنات میں اگرچہ اصلاح کی استعداد موجود تھی لیکن وہ بہت ضعیف تھی۔ اس لئے حضرت حق جل مجدہ کو فجور اور تقویٰ دونوں کی استعداد رکھنے والی مخلوق کو پیدا کرنا مقصود تھا اور اسی مخلوق کو اپنا نائب اور خلیفہ بنانا تھا تاکہ وہ زمین میں احکام شرعیہ کا نفاذ

اور اجرا کرے۔ اور حدود الٰہیہ کو قائم کرے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے جب اس کا اظہار فرمایا تو فرشتوں نے عرض کیا آپ کیا ایسی مخلوق کو پیدا کریں گے جس میں سے کچھ لوگ جرائم اور مفاسد کے مرتکب ہوں گے اور ہم برابر آپ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور سبحان اللّٰہ اور سبحان الملک القدوس ہمارا وظیفہ ہے یا یہ کہ ہم سبحان اللّٰہ وبحمدہ اور سبحان الملک القدوس کے ساتھ آپ کی پاکی اور آپ کی تقدیس کیا کرتے ہیں۔ اس لئے کسی نئی مخلوق کو پیدا کرنے کی بجائے یہ نیابت اور خلافت کا کام ہمارے ہی سپرد کر دیا جائے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اس مخلوق کے پیدا کرنے میں جو مصالح اور حکمتیں ہیں ان کو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ حضرت حق کا ملائکہ سے یہ فرمانا بطور مشورہ نہ تھا اور نہ ملائکہ کے جواب میں کوئی اعتراض تھا۔ جیسا کہ بعض لوگ ان باتوں کے قائل ہوئے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ملائکہ کہ یہ معلوم کیسے ہوا کہ پیدا ہونے والی مخلوق میں سے کچھ لوگ فساد اور خون ریزی کے مرتکب ہوں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ خلیفہ سے وہ سمجھے ہوں گے کیونکہ حدود شرعیہ کا نفاذ اور اجرا تو جب ہی ہو سکتا ہے جب کچھ لوگ حد اعتدال سے تجاوز کرنے والے ہوں یا حضرت حق کے فرمان انی خالق بشرا من طین سے سمجھے ہوں کہ جب اس کے اجزائے ترکیبیہ میں مٹی کو بھی دخل ہے تو یقیناً اس سے کوتاہیوں کا وقوع بھی ہوگا جس طرح جنات کا ان کو تجربہ ہو چکا تھا۔

فائدہ: نیکی اور بدی کے اختیار سے مخلوق میں چار قسم کے احتمال ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ صرف نیکی ہی نیکی کرے۔ دوسرے یہ کہ بدی ہی بدی کرنے والی ہو۔ تیسرے یہ کہ نیکی اور بدی دونوں کا اس سے وقوع ممکن ہو۔ چوتھے یہ کہ نیکی اور بدی دونوں کی مکلّف نہ ہو۔ لہٰذا فرشتے اور جنات تو پہلے سے تھے اب انسان پیدا ہوا جو نیکی اور بدی دونوں کرنے والا تھا اور اس کے ساتھ غیر ذی العقول حیوانات پیدا کئے گئے جو نہ نیکی کے مکلّف ہیں نہ بدی کے۔ ممکن ہے کہ اس طرح صفت خالقیت کے کمال کا ظہور منظور ہو۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. (۳۱) قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ. (۳۲) قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ. (۳۳)

اور اللہ نے تمام چیزوں کے نام آدم کو الہام کر دیے، پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو رکھ دیں، پھر فرشتوں سے کہا اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ (۳۱) فرشتوں نے کہا آپ کی ذات پاک ہے ہم کو معلوم نہیں مگر اسی قدر جتنا آپ نے ہم کو سکھا دیا ہے، بیشک آپ ہی بڑے علم بڑی حکمت والے ہیں۔ (۳۲) تب اللہ نے فرمایا اے آدمؑ تو ان چیزوں کے نام

فرشتوں کو بتادے پس جب آدمؑ نے فرشتوں کو ان اشیاء کے نام بتائے تو خدا نے کہا کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ بیشک میں آسمان وزمین کی تمام مخفی چیزوں کو جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے اور جو کچھ تم پوشیدہ رکھتے ہو وہ سب مجھ کو معلوم ہے۔(۳۳)

تفسیر: اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بنانے اور پیدا کرنے کے بعد ان کو تمام اشیاء کے نام اور خواص سکھا دیئے پھر وہ تمام اشیاء فرشتوں کے روبرو رکھیں اور ان سے فرمایا تم اگر اپنے دعوئے خلافت میں سچے ہو تو ان چیزوں کے نام مجھے بتاؤ۔ اس پر فرشتوں نے عرض کیا اے بارِ الٰہ آپ کی ذات جملہ عیوب سے منزہ ہے ہم کو تو جو کچھ آپ نے سکھا دیا ہے اس کے سوا کسی اور چیز کا علم نہیں ہے۔ بے شک آپ ہی بڑے عالم اور بڑے صاحب حکمت ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اے آدم تم ان اشیاء کے نام ان فرشتوں کو بتا دو، پھر جب حضرت آدم علیہ السلام نے ان اشیاء کے نام ان فرشتوں کو بتائے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے فرشتو! میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں تمام آسمان وزمین کی پوشیدہ اور مخفی چیزوں کو جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو میں ان سب چیزوں کو بھی خوب جانتا ہوں۔

خلاصہ یہ کہ تخلیق آدم کے بعد ان کو تمام کائنات سے روشناس کرایا گیا۔ کیونکہ کہ جب تک ان کو تمام اشیاء کا اور ان کے خواص کا علم نہ دیا جاتا وہ زمین میں نیابت اور خلافت کا فریضہ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جب کسی شخص کو کسی ضلع یا تحصیل کا حاکم بنایا جاتا ہے تو اس کو وہاں کے تمام تفصیلی حالات سے آگاہ کیا جاتا ہے ورنہ وہ حکومت کے صحیح فرائض انجام نہیں دے سکتا۔ اسی طرح حضرت حق جل مجدہٗ نے کائنات کی تمام اشیاء اور اشیاء کے تمام خواص حضرت آدم علیہ السلام کو تعلیم فرمائے اور اس کے بعد فرشتوں کو وہ چیزیں دکھا کر ان کا نام دریافت کیا تو انہوں نے اپنے عجز کا اعتراف کیا، کیونکہ نہ وہ اس خدمت کے اہل تھے نہ وہ بشری ضروریات سے واقف تھے اور نہ ان کو اس قسم کی چیزیں بتائی گئی تھیں اور نہ وہ ضررویات انسانی اور طبیعت حیوانی کو سمجھ ہی سکتے تھے اس لئے ان کو سوائے لَاعِلْمَ لَنَا کہنے کے اور چارہ کار بھی کیا تھا۔ پھر اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ تم ان کو بتاؤ چنانچہ انہوں نے سب چیزوں کے نام اور خواص بتانے شروع کر دیئے اور اس بتانے سے محض حضرت آدم علیہ السلام کی تعلیمی قابلیت کا اظہار مقصود تھا ورنہ ظاہر ہے کہ فرشتوں میں ان سب باتوں کے سمجھنے کی قابلیت ہی کہاں تھی۔ جن میں استعداد خیر وشر نہ ہو اور

جوانسانی طبیعت کے خوگر نہ ہوں خواہ وہ جنات ہوں یا فرشتے وہ نہ نیابت وخلافت کے اہل ہو سکتے ہیں اور نہ کائنات کے خواص کو سمجھ سکتے ہیں ۔فرشتوں میں تو شر کی صلاحیت ہی نہیں البتہ جنات میں خیر کی صلاحیت بہت ہی ضعیف اور کمزور ہے۔لہٰذا انسان ہی اسکا اہل تھا اور اسی کو ہر چیز کا علم دیا گیا اور جب حضرت آدم علیہ السلام نے سب چیزیں بتا دیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم سے کہتا نہ تھا کہ میں ہی تمام آسمان وزمین کے مغیبات سے واقف ہوں اور تم نے جو پانی تسبیح و تقدیس کا اظہار کیا اس کو بھی جانتا ہوں اور خلافت و نیابت کی تفویض کے متعلق جو کچھ تم نے چھپایا اسے بھی جانتا ہوں۔ حضرت حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی اس علمی فوقیت اور برتری کے بعد ملائکہ اور جنات کو علمی تعظیم کا حکم دیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو قبلہ بنا کر ملائکہ اور جنات کو یہ حکم ہوا کہ آدم علیہ السلام کی طرف سجدہ کریں۔

اس آیت سے عالم کی عابد پر فضیلت ظاہر ہوگئی جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم یعنی ایک عالم کو عابد پر ایسی فضیلت اور بزرگی حاصل ہے جیسے میری بزرگی ایک معمولی درجہ کے مسلمان پر۔

۞......۞......۞......۞
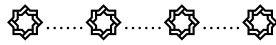
قرآن پاک کی ایک ایسی تفسیر لوگوں کے سامنے آنی چاہیے جو بجائے خود ''الہامی'' ہو اور اتنی سادہ زبان ہو کہ لوگوں کے دل میں اُترتی چلی جائے۔

☆......☆
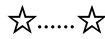
ہم دیکھتے ہیں تو سوچتے نہیں، سوچتے ہیں تو اُٹھتے نہیں۔ہم ان درویشوں کی طرح ہیں، جو مزاجِ خانقاہی میں ''ہمہ اوست'' کی تسبیح پڑھتے ہیں۔

ہم نے بالفاظِ دیگر معجزوں کے سہارے زندہ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ہم نے ایک ذہنی فیتا اٹھا رکھا ہے جو نتیجہ سامنے آئے اسی کو ماپ کر صحیح قرار دے لیتے ہیں۔ہم اس برہمن کی طرح ہیں جو طاق پر سجے ہوئے بتوں کی پوجا کرتا ہے۔ ہمارا دماغ ہے مگر سوچتا نہیں، ہمارا دل ہے مگر دُکھتا نہیں، ہماری نگاہ ہے مگر دیکھتی نہیں۔

(قلم کے چراغ، آغا شورش کاشمیریؒ، ص:۱۶۳)

کشکول

مفتی محمد سعید خان

صحیح ماہ و سال تو اب کسے یاد ہوگا لیکن غالباً نومبر، دسمبر 1985ء کی ایک سردرات میں حضرت اقدس مولانا سید حامد میاں رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ کچھ اور احباب بھی تشریف فرما تھے جن سے شناسائی نہ تھی۔ تصوف اور فقہ کا ایک مسئلہ زیر بحث تھا۔ اپنی یادداشت میں کچھ حوالے تھے، جب پیش کیے تو حضرت قدس اللہ سرہ الاقدس نے ارشاد فرمایا ''آپ ایسے حوالے الگ سے کاپی پر نوٹ کرلیا کیجیے، کبھی کام آجاتے ہیں'' کچھ وقفے کے بعد ارشاد فرمایا ''ہر طرح کے حوالے ہوں گے اس میں، اگر چاہیں تو اس کا نام کشکول رکھ لیں''

جو بات ارشاد فرمائی گئی تھی، پلے باندھ لی اور اب تک بھی، دوران مطالعہ، کہیں بھی اور جو بھی، مفید مطلب بات نظر آتی ہے، بطور یادداشت اس کا حوالہ جلد وصفحہ کی قید کے ساتھ ''کشکول'' میں ''ڈال'' دیا جاتا ہے۔

؎ صدقے ترے کرم کے، نہ دے زحمت سوال
کشکول ہے فقیر کا، دست دعا نہیں

جس ہستی نے یہ نام ''کشکول'' تجویز فرمایا تھا اور جن کی یاد میں اس ماہنامے کا اجراء ہوا ہے، خیال آیا کہ سال نو 2011ء کے آغاز سے اس ہستی کی یاد اور ایصال ثواب کے لیے ''کشکول'' ہر ماہ تسلسل کے ساتھ نذر قارئین کیا جائے۔

پیش خدمت ہے۔

جستجوئے حق

ہمارے دور میں اسلام کے نام پر اتنے فرقے بن گئے ہیں کہ ایک طالب حق کے لیے جستجو حق دشوار سے دشوار تر ہوگئی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دین سے تو منسلک رہنا ہی ہے۔ اسلام اور شریعت کو تو کسی قیمت پر بھی چھوڑا نہیں

جاسکتا۔ ہر فرقے کے قائدین اپنے متبعین کو یہ باور کراتے ہیں کہ راہ حق صرف انہی کی راہ ہے اور ان کے ماسوا سب باطل ہے۔ بعض لوگ اس صورت حال کو بہانہ بنا کر اصل دین ہی سے فرار کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے نفس کی آزادی اور شریعت کی قیود کو توڑنے کی غرض سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ حقیقت تک رسائی ناممکن ہے۔ ہر ہر گلی اور ہر ہر کوچے میں ہر ہر فرقے کے مولویوں نے اپنا مدرسہ اور مشائخ نے اپنی خانقاہیں کیا دوکانیں کھول رکھی ہیں ہم جائیں تو کہاں جائیں؟

اس سوال کا جواب حضرت شاہ سید محمد ذوقی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''سرِّ دلبراں'' میں خوب دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

بعض لوگ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ اہل اللہ سے زمانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ مگر ان کا پتا چلانا بہت دشوار ہے۔ مکار اور گندم نما جو فروش لوگوں نے کثرت سے پیری مریدی کی دکانیں کھول رکھی ہیں کہ حق و باطل میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ انتخابِ شیخ کے لیے بڑی بصیرت کی ضرورت ہے۔ جو مبتدیوں کے زمرہ میں بھی داخل نہ ہو وہ اصل کو نقل سے کیونکر جدا کر سکتا ہے اور دیدہ و دانستہ اپنے دین و ایمان کو ایک مشکوک اور نا قابلِ اعتماد شخص کی حفاظت میں کیسے دے سکتا ہے۔ یہ بالکل سچ ہے۔ مگر مکاری اور گندم نما جو فروشی کا دَور دَورہ تو آج کل بہت ہی عام ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ان مشکلات سے خالی نہیں۔ اطباء کے جھوٹے اشتہارات کی وہ کثرت ہے کہ سچے اور جھوٹے کی تمیز کرنا دشوار ہے۔ اشیائے ضرورت کی خرید و فروخت میں بے ایمانی اور بد معاملگی کو اس درجہ دخل ہو گیا ہے کہ بڑے بڑے تجربہ کار اور ہوش مند لوگ بھی چڑ چڑ کے پر چڑ کے کھا رہے ہیں۔ بڑے اور متمدن شہروں میں تو دُکانوں پر کھانے پینے کی چیزیں مثلاً خالص گھی یا خالص دودھ تک ملنا تقریباً محال ہو گیا ہے۔ بعض بڑے بڑے ''مہذب'' تاجروں کے متعلق اس قسم کی شکایات اکثر سننے میں آیا کرتی ہیں کہ نمونہ تو اعلیٰ دکھلایا مگر مال ادنیٰ دیا گیا۔ باوجود ان دقتوں کے اور باوجود ان بد معاملگیوں اور دغا بازیوں کے کوئی کہہ سکتا ہے کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جو ضرورت کے وقت اطبا کے مشورے سے گریز کرنے لگے ہوں یا جنھوں نے گھی کے استعمال کو ترک کر دیا ہو۔ یا بغیر دودھ کی چائے پینے کا اپنے کو عادی بنا لیا ہو۔ کتنے لوگ اس ملک میں ایسے نکلیں گے جنھوں نے محض تاجروں کی بد دیانتی کے خوف سے بازار کا جانا آنا اور اشیائے ضروری کا خریدنا بند کر دیا ہو۔ جب کسی بھی طبیب کی ضرورت پیش آتی ہے تو پوری سعی کام میں لا کر اپنے اطمینان کا کوئی نہ کوئی طبیب ڈھونڈ ہی نکالا جاتا ہے۔ کوئی ضرورت سامنے آتی ہے تو خواہ کتنی دشواریوں اور رکاوٹوں کا مقابلہ ہو کوئی نہ کوئی سبیل

اس کے رفع کرنے کی پیدا کر ہی لی جاتی ہے۔ضرورت، اور اس ضرورت کا احساس پیدا ہونا شرط ہے۔امورِ دنیا میں حصولِ مقصد کے لیے بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی سدِ راہ نہیں ہوتی۔مسلسل ناکامیاں بھی سعیِ لاحاصل کے دست وبازو کو سُست نہیں پڑنے دیتیں۔تلاش وانتخابِ شیخ ہی ایک ایسی انوکھی ضرورت ہے کہ باجود اس اعتراف کے کہ اہل اللہ سے زمانہ خالی نہیں کسی کو کوئی تدبیر ہی اس مرحلہ کے طے کرنے کی نظر نہیں آتی۔نفس کی چوریوں کو ذرا ٹٹولا جائے واضح ہو جائے گا کہ طلب ہی ناقص ہے۔اس ضرورت کو ضرورت ہی نہیں سمجھا گیا۔تلاشِ شیخ کے لیے اتنی بھی زحمت نہیں اٹھائی جاتی جتنی کہ ایک گمشدہ نوٹ بک کی تلاش میں اٹھائی جاتی ہے۔اس بارہ میں جتنے بھی عذر پیش کئے جاتے ہیں، سب عذرِ لنگ ہیں۔

(زیرِعنوان: عذر لنگ، ص:۱۲۸، ۱۲۹)

خِیَار

لفظ ''خِیَـار'' اردو زبان میں دو معنوں میں بولا جاتا ہے۔ایک تو ''خِیَـار'' بمعنی نیک لوگ، فضیلت اور بزرگی رکھنے والے لوگ۔چنانچہ نظم طباطبائی میں ہے۔

جو دین حق میں آگئے باطل کو چھوڑ کر
داخل وہ گئے ہیں صلحاء و خیار میں

اور ''خِیَار'' کے دوسرے معنی ہیں ''کھیرا یا ککڑی'' جو کہ مشہور سبزی ہے اور غذا اور دوا دونوں طرح سے کھائی جاتی ہے۔سوداؔ کہتے ہیں۔

جو غول تیرے سامنے آیا تو سمجھے یہ
ایک کھیت روبرو ہے ہمارے پر از خیار

شیخ بہاؤالدین محمد العاملی المتوفی ۱۰۳۱ھ اپنے ''کشکول'' میں تحریر فرماتے ہیں۔

ایک صوفی بغداد کی سبزی منڈی سے گذر رہا تھا اور ایک سبزی فروش صدا لگا رہا تھا ''خِیَـار (کھیرے) دس روپے میں، کھیرے دس روپے میں'' صوفی اس صدا کو سن کر پیٹنے لگا اور بولا ''ہائے ہائے'' جب خِیَـار (اچھے لوگوں) کی قیمت دس روپے ہے تو اشرار (برے لوگوں) کی قیمت کیا ہوگی[1]۔

---

[1] مر بعض الصوفية ببغداد، وإذا بسوقي ينادي الخيار عشرة بدرهم، فلطم الصوفي وجه نفسه، وقال: اذا كان الخيار عشرة بدرهم، فكيف بالأشرار؟!. قبيل عنوان، للشيخ نظامي، ج:۳، ص:۱۲۲

وجود و شہود

ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ وہ امام محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفۂ وحدت الوجود سے متاثر اور اس نظریے کے حامی تھے یا پھر یہ کہ ان پر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کا غلبہ تھا اور انہوں نے وحدت الشہود کی زبردست وکالت کی تھی، نہایت دشوار ہے۔ وحدت الوجود کی ترجمانی دیکھنی ہو تو وہ پیام مشرق میں کہتے ہیں۔

تلاش او کنی جز خود نہ بینی   تلاش خود کنی جز او نیابی

اگر اللہ تعالیٰ کی تلاش کرو گے تو اپنے علاوہ کسی کو نہ پاؤ گے اور اگر اپنے وجود کو تلاش کرو گے تو اس ذات اقدس کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

جاوید نامہ میں کہتے ہیں۔

لَا اِلٰہ تیغ و دمِ او عبدہٗ   فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ

لا الہ ایک تلوار اور اس کا بندہ اس تلوار کی آب ہے۔ تم اس سے بھی واضح بات پوچھتے ہو تو پھر یہ کہو کہ جسے ’’عبدہ‘‘ کہتے ہو وہ دراصل ’’ھو‘‘ ہے۔

بال جبریل میں ارشاد ہوتا ہے۔

یہ نکتہ میں نے سیکھا ابوالحسن سے   کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی   اگر بے زار ہو اپنی کرن سے

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

تو شاخ سے کیوں پھوٹا، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂ پیدائی، اک لذت یکتائی
غواص محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں، دریا کی گہرائی

’’ارمغان حجاز‘‘ جس کی تکمیل ان کی وفات سے کچھ ہی پہلے ہوئی، اس میں گویا ہوئے۔

زمین و آسمان و چار سو نیست   دریں عالم بجز اللہ ھو نیست!

زمین، آسمان اور یہ چاروں جہتیں کچھ نہیں ہیں۔ اس کائنات میں سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں۔ یہ سب کچھ اس ''اصل'' کا ''عکس'' ہے، جو ''اصل'' فتوحات مکیہ اور مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ میں موجود ہے۔

لیکن دوسری طرف ''وحدۃ الشہود'' بھی ملاحظہ ہو۔ مولانا عبدالمجید خان سالک مرحوم لکھتے ہیں۔

میں شام کے وقت جب حسب معمول حاضر خدمت تھا کہ ایک بزرگ فقیر حضرت کے پاس آئے۔ باتیں شروع ہوئیں۔ حضرت نے فرمایا۔ "سائیں جی میرے لیے دعا کیجیے۔ وہ کہنے لگا ''کیا آپ کو دولت مطلوب ہے؟'' فرمانے لگے "نہیں"۔ مجھے دولت کی ہوس نہیں۔ درویش آدمی ہوں۔ اللہ مجھے ضرورت کے مطابق عطا کر دیتا ہے۔ پھر فقیر نے پوچھا۔ ''کیا دنیا میں عزت وجاہ کے طلب گار ہو؟'' حضرت نے فرمایا۔ ''نہیں'' وہ بھی اللہ کے فضل سے حاصل ہے۔ میں کسی اونچے رتبہ کا طالب نہیں ہوں۔ سائیں جی نے پوچھا تو پھر کیا خدا سے ملنا چاہتے ہو؟''

اس پر حضرت کی آنکھوں میں خاص چمک پیدا ہوئی۔ فرمانے لگے۔ ''خدا سے ملنا؟ سائیں جی خدا خدا کرو۔ مَیں اس سے کیوں کر مل سکتا ہوں۔ مَیں بندہ۔ وہ خدا، میرا اُس کا واسطہ صرف بندگی کا ہے۔ ملنا کیا معنی؟ اگر مجھے معلوم ہو جائے۔ کہ خدا مجھ سے ملنے آ رہا ہے۔ تو مَیں بیس کوس بھاگ جاؤں اس لیے کہ دریا قطرے سے ملے گا۔ تو قطرہ غائب ہو جائے گا۔ مَیں قطرہ کی حیثیت سے قائم رہنا چاہتا ہوں۔ اور اپنے آپ کو مٹانا نہیں چاہتا۔ بلکہ قطرہ رہ کر اپنے آپ میں دریا کے خواص پیدا کرنا چاہتا ہوں۔

اس پر سائیں بے خود ہو کر جھومنے لگے۔ اور کہنے لگے۔ واہ اقبال بابا۔ جیسا سُنتے تھے ویسا ہی پایا۔ تُو خود آگاہ مشرب ہے۔ تجھے کسی فقیر کی دعا کی کیا ضرورت ہے۔

(اقبال نامہ، مصنف چراغ حسن حسرت، زیر عنوان: علامہ اقبال از سالک، ص:۳۸)

قسط نمبر ۳
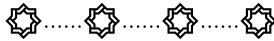
علمائے ہند کا سیاسی موقف

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

اگر یہ صحیح ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو حضرت شیخ الہند ملکی سیاسیات میں جس جذبہ اور جس فکر ونظر کے حامل تھے اس کا اندازہ حضرت مرحوم کے تلامذہ وصحبت یافتگان خصوصی کے فکر ونظر اور ان کے عملی کارناموں سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا سندھی اور حضرت شاہ صاحب کا اجمالی تذکرہ ہو چکا ہے۔ اب مرحوم کے ایک اور نہایت ہی مخصوص ومقرب اور شریک جلوت وخلوت تلمیذ رشید کے افکار پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

شیخ الاسلام مولانا السید حسین احمد المدنی رحمۃ اللہ علیہ: یوں تو حضرت شیخ الہند کی ذاتِ ستودہ صفات ایک پارس کی پتھری تھی کہ جو بشرط صلاحیتِ ذاتی واستعدادِ فطری اس کے فیض واثر سے بہرہ یاب ہوا کھرا سونا بن گیا۔ اور آج ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں اس ابرِ کرم کی عطا گستری کا فیض نہ پہنچا ہو، لیکن جن حضرات نے حضرت شیخ الہند کی زندگی میں آپ کے دستِ راست کی حیثیت سے کام کیا اور آپ کی وفات کے بعد ہمہ تن اس مقصدِ اعلیٰ وارفع کی تکمیل میں لگ گئے ان میں مذکورہ بالا دو حضرات کے علاوہ ایک نام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے، جہاں تک اپنے استاد سے اختصاص اور تقرب کا تعلق ہے ان تینوں میں کوئی خط امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا البتہ اپنی اپنی فطری صلاحیتوں اور ذاتی استعداد وقابلیت اور شخصی ملکات وکمالات کے اعتبار سے ہر ایک کا مقام جدا جدا ہے خدا کے فضل وکرم سے مولانا مدنی اب تک ہم میں موجود ہیں اور آپ کے افکار ونظریات اور آپ کے عمل کا چرچا آج ہر شخص کی زبان پر ہے۔ ملک کا کوئی مسلمان اور کوئی لکھا پڑھا ہندو اور سکھ ایسا نہیں ہے جس کو یہ نہ معلوم ہو کہ مولانا کیا ہیں، مولانا نے جمعیۃ علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے کیا کیا؟ اس کا ذکر تو بہت بعد میں آئے گا اس وقت سوال صرف ملکی اور وطنی سیاست میں نقطہ نظر اور مسلک کا ہے جس سے حضرت شیخ الہند کی تحریک کی اصل روح پر روشنی پڑے اور یہ واضح ہو کہ سیاست کے میدان میں ہندوؤں سے بھی قبل آنے کی صورت میں علماء ہند کا مطمح نظر فرقہ ورانہ تھا یا جمہوری؟ ان کی جدوجہد صرف مسلمانوں کے لیے تھی یا سب کے لیے، وہ ہندوؤں کے دوست تھے یا دشمن؟ پس جہاں تک مولانا مدنی کی ذات کا تعلق ہے۔ اس کے جواب میں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مولانا کی تقریریں، خطبات اور تحریریں

بکثرت موجود ہیں۔ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک دفتر بن جائے۔

قومیت متحدہ: یوں تو گذشتہ دو سو برس کی تاریخ میں آپ کو کوئی عالم ایسا نہیں ملے گا جو ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد پر زور نہ دیتا ہو اور اس کی اہمیت وضرورت کا قائل نہ ہو۔اور اس کے برخلاف انگریزوں کو پردیسی اور بعید الوطن قرار دے کر ہندوستان پر ان کی حکومت سے بیزار نہ ہو۔لیکن جب تک مسلم لیگ نے زور نہ پکڑا تھا قومیت کا مسئلہ نکھرا نہ تھا۔نہ ہندوؤں میں اس کا چرچا تھا اور نہ مسلمانوں میں، البتہ عام اصطلاح میں قومیت کے لفظ سے مختلف معنی مراد لیے جاتے ہیں کبھی اس سے مراد مذہب ہوتا تھا اور کبھی کوئی نسلی یا خاندانی امتیاز۔مثلاً یہ شخص فلاں قوم سے ہے، بولتے تھے تو کبھی اس سے مراد یہ ہوتی تھی کہ یہ ہندو ہے یا مسلمان اور کبھی یہ مسلمان ہو کر شیخ ہے یا پٹھان یا ہندو ہو کر برہمن یا کائستھ، بہر حال ہندو مسلمان دونوں بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے اس کی تحقیق وتدقیق کی ضرورت ہی نہ تھی کہ دونوں میں قومیت بھی مشترک ہے یا نہیں۔اشتراکِ عمل کے لیے یہی کافی تھا کہ دونوں ایک ہی ملک کے رہنے بسنے والے ہیں۔ایک بولی بولتے ہیں، ملے جلے رہتے ہیں، رنگ وروپ خط وخال ایک سے ہیں ملکی اور وطنی ضرورتیں یکساں ہیں ایک کنویں یا ایک دریا سے پانی پیتے اور ایک ہی کھیت کا غلہ اور اناج کھاتے ہیں۔

لیکن جب مسلم لیگ نے ہندو اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے اور اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے دو قوموں کا نظریہ ایجاد کیا تو مولانا مدنی اس کا جواب دینے کے لیے پوری قوت سے میدان میں آ گئے آج تک بہت سے لوگوں کے کانوں میں مولانا کا یہ فقرہ جو انہوں نے دہلی کے ایک بڑے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا گونج رہا ہوگا کہ

''قومیت مذہب سے نہیں ملک سے بنتی ہے''

اس فقرہ کا اخبارات میں شائع ہونا تھا کہ لیگی اخبارات اور مصنفین واہل قلم نے مولانا پر سب وشتم اور طعن وتشنیع کا ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ وہ سب کچھ کیا جو یزید کے ساتھیوں نے جگر گوشۂ رسول حسین بن علی رضی اللہ عنہم اور ان کے اہل بیت کے ساتھ کیا تھا۔لیکن مولانا ایک پتھر کی چٹان تھے۔جس بات کو حق سمجھتے تھے جاہل مسلمانوں کی ژاژ خائی کے ڈر سے وہ کیوں کر اس کا انکار کر سکتے تھے۔چنانچہ اس کے بعد آپ نے ''قومیت متحدہ اور اسلام'' کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا اور اس میں قرآن مجید کی آیات، احادیث نبوی، آثار صحابہ اور لغت سے یہ ثابت کیا کہ اختلافِ مذہب کے باوجود جو لوگ ایک ہی ملک کے باشندے ہوں وہ سب ایک قوم ہیں اور اس بناء پر لیگ کا یہ دعویٰ کہ ہندو اور مسلمانوں کا مذہب چونکہ جدا جدا ہے اس لیے یہ دونوں الگ الگ قومیں ہیں بالکل غلط،

لغو اور لچر ہے۔ پھر آپ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے بعد آپ کی کوئی تقریر، کوئی تحریر اور کوئی خطبہ ایسا نہیں جس میں پوری قوت اور بلند آہنگی کے ساتھ قومیتِ متحدہ کی حمایت اور دو قوموں کے نظریہ کی مخالفت نہ کی گئی ہو، علاوہ بریں مولانا ایک عرصۂ دراز سے کانگریس کے ممبر ہیں۔ کئی سال تک یو۔ پی کانگریس کمیٹی کے وائس پریذیڈنٹ رہے ہیں اور اب چند سالوں سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر ہیں۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ مولانا کانگریس کے اصول سے اتفاق رکھتے ہیں اور کوئی شبہ نہیں کہ آپ نے اپنے اس اتفاق کا عملی مظاہرہ ان لاکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں سے کہیں زیادہ شاندار طریقہ پر کیا ہے، جو کانگریس کے ممبر ہونے کے باوجود عملاً اس کے اصول کی پرواہ نہیں کرتے اور یا جنہوں نے کانگریس کا ممبر بن کر نسلوں، اسمبلیوں کی ممبری یا کسی سرکاری عہدہ یا کسی اور مالی منفعت کی شکل میں کسی قسم کا کوئی فائدہ حاصل کیا ہے۔ پھر کیا کوئی ایک شخص بھی جو مولانا کے تصلب فی الدین، جرأت اعلانِ حق، بے باکی اور بے خوفی سے واقف ہے ایک لمحہ کے لیے بھی تصور کرسکتا ہے کہ مولانا کا یہ عمل تحریک شیخ الہند کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ جو شخص برطانیہ عظمیٰ کی بے پناہ طاقت وقوت سے مرعوب نہ ہوا ہو کیا وہ ہندوؤں کی خوشامد کرسکتا ہے۔ کیا وہ اپنے استاد کی تعلیم کے برخلاف کسی لالچ یا کسی فریب میں مبتلا ہو کر کوئی غلط راستہ اختیار کرسکتا ہے؟ کیا کوئی اسے باور کرسکتا ہے کہ مولانا جب قومیت متحدہ کا ادعا کرتے ہیں تو یہ صرف ایک وقتی مصلحت اور تقاضا ہے؟[1]

غایت بلند نظری: مولانا کی بے لوثی، بلند نظری اور انتہائی عالی ہمتی جس سے ہندو مسلمان ہر ایک کو سبق لینا چاہیے اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ ۱۹۳۱ء میں جب لکھنؤ میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس کا اجلاس ہوا اور اس کے

---

[1] میں مولانا کی سوانح عمری نہیں لکھ رہا ہوں لیکن ایک چشم دید واقعہ کا ذکر کیے بغیر رہا نہیں جاتا۔ غالباً ۴۴ء کا واقعہ ہے کہ اوکاڑہ ضلع منٹگمری کی انجمن اسلامیہ نے اپنے جلسہ میں تقریر کرنے کے لیے راقم الحروف کو بلایا تھا، حضرت مولانا مدنیؒ بھی تشریف لائے تھے، شام کے وقت میں قیام گاہ پر آیا تو دیکھا بہتیرے مسلمانوں کے ساتھ چند سکھ بھی وہاں پر موجود ہیں۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ سکھ، حضرت مولانا کا نام اور تعریف تو پہلے سے سنے ہوئے تھے۔ مگر اب مولانا کو یہاں بچشم خود دیکھا تو غایت عقیدت وارادت سے مکان پر چلے آئے اور درخواست کررہے ہیں کہ مولانا ان کو بیعت فرمالیں، ان کے علاوہ جو مسلمان آئے تھے وہ بھی بیعت ہونے کے لیے آئے تھے۔ یہ سن کر مجھ کو فوراً اقبال مرحوم کا شعر یاد آگیا۔

؎ سجدۂ تو برآور داز دلِ کافراں خروش   اے کہ دراز ترکنی پیشِ کساں نماز را

بعد یہ سب لوگ آل پارٹیز کانفرنس کے نمائندوں سے فرقہ ورانہ سمجھوتہ پر گفتگو کرنے کے لیے الہ آباد آئے ، یہاں چار روز تک باہم گفتگو ہوتی رہی مگر پھر بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، مولانا مدنی بھی اس جلسہ میں شریک تھے آپ چاروں دن خاموش رہے آخر ایک صاحب نے مولانا سے کہا کہ حضرت! آپ بھی تو کچھ فرمایئے کہ ان معاملات کے بارہ میں جمعیۃ علمائے ہند کی رائے کیا ہے؟ مولانا نے بڑے سکون اور اطمینان سے فرمایا:

> ''ہمارا تو ایک مطالبہ ہے جو ہم کانگریس کو دے چکے وہ یہ کہ ملک کو اختیارات ملنے پر مسلمانوں کو اپنے مذہبی معاملات طے کرنے کے لیے قاضی مقرر کرنے کا حق عطا کیا جائے اور ہم نے کہہ دیا ہے کہ جب تک ملک کو آزادی حاصل نہ ہو ہم خاموشی کے ساتھ آزادی کی جنگ میں شریک رہیں گے البتہ آزادی ملنے پر ہمیں یہ حق نہ ملا تو پھر اس وقت اگر ہم میں قوت ہوگی تو ہم اسے منوالیں گے''۔

مولانا سید طفیل احمد جو خود اس جلسہ میں غالباً شریک تھے۔اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد اپنے اور ارباب جلسہ کے تاثرات اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

> ''اس وقت صاف معلوم ہوتا تھا کہ مولانا موصوف اور ان کی جمعیت دوسری سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں کس قدر بلند سطح پر تھی۔انہیں علماء کی نسبت بالعموم کہا جاتا ہے کہ وہ تنگ خیال اور ترقی کی راہ میں مزاحم ہوتے ہیں، ان کی نظر صرف مقدس مقامات اور اسلامی ممالک ہی تک محدود رہتی ہے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ مذہبی اور قومی مسائل پر غور کرتے کرتے اب ان کا دائرہ نظر اس قدر وسیع ہوگیا ہے کہ تمام دنیا کے ملکی حالات اور سیاسی مسائل ان کے پیش نظر رہتے ہیں اور قومی وملکی مفاد کے پیش نظر وہ ہر قسم کے مصائب وآلام اٹھانے کو تیار ہوجاتے ہیں۔اگر قربانیاں دیتے دیتے یہ ادارہ خدانخواستہ ختم بھی ہوجائے تو اس کی راکھ سے ایسے ایسے سورما اٹھیں گے جو انجام کار ملک کو آزاد کرائیں گے۔
>
> (مسلمانوں کا روشن مستقبل، پانچواں ایڈیشن، ص:۵۴۵)

تحریک شیخ الہند اسلامی تھی یا ہندوستانی: بہر حال مولانا سندھیؒ، حضرت شاہ صاحبؒ اور مولانا مدنیؒ کے خیالات وافکار اور ان کے سیاسی طرز عمل اور ان کی جماعتی جدوجہد کی روشنی میں اب اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ

حضرت شیخ الہند کی تحریک کا مقصد جہاں ایک بین الاقوامی تصورِ سیاسی کی بنیاد پر برطانوی شہنشاہیت کو مفلوج واز کار رفتہ بنا کر مشرق وسطٰی کی زبوں حال حکومتوں کو اس کی دستبرد سے بچانا تھا ساتھ ہی ایک سچے مخلص محبّ وطن کے نقطہ نظر سے اپنے ملک اور وطن کو (جسے مولانا مدنی اکثر اپنی تحریروں میں ''پیارے ہندوستان'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور جس کے محاسن وفضائل میں انہوں نے اپنے ایک خطبہ میں مسلسل کئی صفحات لکھے ہیں۔) آزاد کر کے یہاں جمہوری نیشنل قومی اور وطنی حکومت قائم کرنا بھی اس کا مقصدِ عظیم تھا۔اس حیثیت سے اس تحریک کا دائرہ اثر صرف ہندوستان تک محدود نہیں رہتا بلکہ مشرق وسطٰی اور ان کے ذریعہ سے تقریباً تمام ایشیاء بھی اس دائرہ میں آجاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تحریک اصطلاحاً اسلامی تھی یا ہندوستانی اور وطنی، جواب یہ ہے کہ یہ وطنی تحریک بھی تھی اور اسلامی بھی۔ وطنی اس لیے کہ اس کا تعلق وطن سے تھا۔ملک کو آزاد کرانے اور اس کی حریت واستقلال سے تھا اور اسلامی اس لیے کہ مسلمان کا کوئی کام غیر اسلامی نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اس کے خالص دنیوی کام بھی مثلاً کھانا پینا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، روزی کمانا، اولاد کے ساتھ بیٹھ کر ہنسی مذاق کرنا، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردی غمگساری اور شرافت وانسانیت کا معاملہ کرنا، حد یہ ہے کہ شادی بیاہ کرنا یہ سب کام اگر خدا کی خوشنودی کے لیے اور اس کے حکم کی تعمیل کی نیت اور ارادہ سے ہوں اور اسلامی احکام وتعلیمات کے مطابق ہوں تو یہ اسلامی کام ہیں اور ان پر اس کو ایسا ثواب ملے گا جیسا کہ عبادات کی بجا آوری پر ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا مذہب عین سیاست ہے اور سیاست عین مذہب ان دونوں میں تفریق ناممکن ہے۔

مذہب اور سیاست: بعض مغربی تعلیم یافتہ نوجوان علماء پر اعتراض کرتے ہیں کہ علماء مذہب کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چلتے۔ اگر واقعہ یہی ہے تو پھر آج کل کی سیاست میں کس طرح کوئی ترقی پسندانہ اقدام کر سکتے ہیں۔ جواب میں گذارش یہ ہے کہ قطع نظر اس سے کہ اسلام کتنا مکمل اور جامع دینِ فطرت ہے اگر علماء پر یہ اعتراض صحیح ہے کہ وہ مذہب کے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑتے تو علماء کے ساتھ اس جرم میں برابر کے شریک ملک کے سب سے بڑے لیڈر اور ہند کے باپو گاندھی جی بھی ہیں کیونکہ ان کا حال بھی یہ ہی تھا کہ مذہب اور اپنے یقین کے مطابق خدا کے حکم کے بغیر وہ کوئی نجی یا قومی اور سیاسی کام نہیں کرتے تھے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ جس طرح پچھلے دنوں خواہشاتِ نفس کو تسکین دینے کی غرض سے کہنے والے کہتے تھے کہ علماء کو سیاست نہیں آتی۔ وہ اپنے تقویٰ، طہارت، پاک باطنی اور حسنِ کردار کے باعث فرشتہ بن سکتے ہیں۔لیکن سیاست

داں نہیں ہو سکتے ۔ٹھیک اسی طرح گاندھی جی کی اعلیٰ روحانیت اور اُن کی غایت درجہ مذہبیت کے باعث یورپ میں کچھ لوگ ایسے تھے جو ان کا مذاق اڑاتے تھے اور جو کبھی ان کے اقوال میں یا قول وفعل میں تضاد ثابت کرتے اور کبھی ان کے لباس پر طنز کرتے تھے غیر تو پھر بھی غیر ہیں، ان سے کیا شکوہ اور کیا گلہ! حد یہ ہے کہ خود ہندوستان میں اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور باخبر حضرات کا ایک ایسا گروہ موجود ہے جو گاندھی جی کو محض ان کی روحانیت اور مذہبیت کی وجہ سے سیاست داں تسلیم نہیں کرتا۔ چنانچہ ہندوستان کے مشہور اخبار نویس سر ختیاپامنی اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مہاتما گاندھی موجودہ حالت سے کہیں زیادہ بلند مرتبہ پر ہوتے اگر وہ سیاست میں نہ پڑتے۔ مہاتما جی پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگرچہ وہ ان سب لوگوں سے جنہوں نے سو برس کی مدت میں ملک کی سیاسی خدمات انجام دی ہیں سب سے بڑے شخص ہیں تاہم وہ ملک کے سب سے زیادہ دانشمند رہنما نہیں ہیں۔ مسٹر جے۔ اے اسپنڈر نے ڈسرا ہیلی کی نسبت کہا ہے کہ وہ فطرتاً باطنیت اور مقدرات کے قائل آدمی تھے۔ یہ قول بہت حد تک مہاتما جی پر صادق آتا تھا۔ یہ بدقسمتی ہے کہ ایسے بلند روحانی مدارج رکھنے والوں کے لیے سیاسیات نہیں بنائے گئے اور نہ سیاسیات ان کے لیے مناسب ہیں''۔

(Indian Politics Since Mutiny اردو ترجمہ، ص:۱۷۷)

مذہب سے بَیر یا گاندھی جی کی سیاسی پالیسی سے اختلاف رکھنے والے اپنے دعاوی کے ثبوت میں خواہ ان کی روحانیت اور مذہبیت پر کتنا لعن طعن کریں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے نزدیک ہندوستان کی جنگ آزادی کا اصل ہیرو کون ہے؟ ہندوستان کی غلامی کی زنجیریں کس کی سیاست اور کس کی رہبری نے پارہ پارہ کیں؟ پھر ہندوستان آزاد ہوتے ہی فرقہ وارانہ بغض وعناد کے باعث جن خطرات میں گھر گیا تھا ہندوستان کو ان خطرات سے کس نے نکالا؟ اور اب اگر ہندوستان ترقی کرے گا اور پھلے پھولے اور خوش حال رہے گا تو کس کے نقش قدم پر چل کر اور کس کی بتائی ہوئی راہ پر پڑ کر؟ ان سب سوالات کا جواب صرف ایک ہی ہے، دوسرا نہیں ہو سکتا یعنی یہ کہ گاندھی جی!

اور پھر ہندوستان کے موجودہ گورنر جنرل شری راجگو پال آچاریہ کو دیکھئے تو یہ بھی کیا کم ہیں؟ ان کا کوئی پیغام، کوئی تقریر اور کوئی تحریر ایسی نہیں ہوتی جس میں بار بار خدا کا ذکر، مذہبی تعلیمات اور روحانی اخلاق کا تذکرہ نہ آتا ہو اور

اس طرح سیاست کے پیچیدہ سے پیچیدہ مبحث پر اخلاقیات مذہبی کی روشنی میں غور نہ کیا گیا ہو۔لیکن کون نہیں جانتا کہ یہ ایک کھدر کی دھوتی اور کرتہ میں ملبوس نظر آنے والا انڈین یونین کا سب سے بڑا حاکم، ہند اور پاکستان دونوں کا سب سے بڑا پارلیمنٹری قابلیت کا مالک اور سب سے بڑا سیاست داں اور مدبّر ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، ہند کے کتنے ہی بڑے ہر دل عزیز اور مقبول و پسندیدہ لیڈر ہوں لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اگر گاندھی جی کا دست شفقت ان کے سر پر نہ ہوتا اور وہ مذہب سے متعلق اپنے ذاتی خیالات کو اپنے ہی تک محدود رکھ کر گاندھی جی کی رہنمائی میں نہ چلتے تو وہ ہرگز یہ مقامِ رفیع و بلند حاصل نہیں کر سکتے تھے۔پس جو چیز گاندھی جی، شری راجگو پال آچاریہ جی کے حق میں ان کا سیاسی لیڈرشپ کے لیے عیب یا نقص نہ ہو سکی وہ علماء کے لیے کیوں کر نقص اور عیب کا سبب بن سکتی ہے؟

علماء کی نسبت اس طرح کی باتیں سن کر بے ساختہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ یاد آ جاتا ہے،لوگ عام طور پر آپ کے متعلق بھی اسی طرح کی باتیں کہتے تھے،آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو ایک روز خطبہ میں ارشاد فرمایا:

> ''تم کہتے ہو کہ علی کو سیاست نہیں آتی۔ہاں ٹھیک کہتے ہو۔بات یہ ہے کہ لوگ جس کی اطاعت نہیں کرتے اس کی نسبت اسی قسم کی باتیں کہا کرتے ہیں "لا سیاسة لمن طاعة له" میرا حال بھی یہ ہی ہے میں تم سے سردیوں کے موسم میں اہل شام سے جنگ کرنے کے لیے کہتا ہوں تو کہتے ہو حضرت! بڑی سخت سردی پڑ رہی ہے یہ کم ہو جائے تو پھر جنگ کریں گے۔پھر میں گرمیوں میں شام کے لوگوں سے جنگ کرنے کو کہتا ہوں تو اس وقت بھی تم ایسے ہی ٹال مٹول کی بات کرتے جاتے ہو اور کہتے ہو سخت لُو چل رہی ہے دھوپ میں بڑی تمازت ہے۔یہ کم ہو جائے تو جنگ کریں گے، پس بات تو تم میری مانتے نہیں ہو اور کہتے ہو کہ علی کو سیاست نہیں آتی''۔

اور ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کیا موقوف ہے۔ان کے فرزند ارجمند نے حق کے لیے مظلومیت کے ساتھ جان دے دی اور کہنے والوں نے یہ ہی کہا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ سب کچھ تھے۔مگر سیاست کے مرد میدان نہیں تھے۔ اگر سیاست نام ہے اپنے مقصد کے لیے ہر قسم کا جائز و ناجائز، بُرے اور بھلے ذرائع کو اختیار کرنے کا یہ تو سیاست ''شیشہ گران مغرب'' کو مبارک ہو یا ان کو مبارک ہو جو اسلام سے دور کا بھی واسطہ اور تعلق نہ رکھنے کے باوجود اسلام کی حکومت اور قرآنی بادشاہت کا نام لے لے کر خدا اور قرآن کے ساتھ تمسخر کرنے کی رندانہ جرأت رکھتے ہوں اور جنہوں نے دین قیم کے مقدس نام کو اپنے اغراض و اہوا کا آلۂ کار بنالیا ہو۔بہر حال علماء کی نسبت ہمیں صاف لفظوں میں اقرار کرنا چاہیے

کہ انہیں ایسی سیاست نہیں آتی اور ایک انہیں کو کیا دنیا کے کسی شریف، خوددار، غیرت مند، باحیا اور بااصول انسان کو ایسی سیاست نہیں آسکتی۔

ہیگل اور کارل مارکس کی شریعت پر اندھا دھند ایمان لانے والے خواہ کچھ کہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک چینی صاحب قلم لن یوٹن (Lin Yutan) کے قول کے مطابق خدا کا اعتقاد ہندوستان کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ہندوستان کا عیب نہیں ہنر ہے۔ نقص نہیں فخر ہے۔ عبرت کی آنکھ کھولنے کے لیے موجودہ یورپ کی سیاسیات بہت کافی ہیں۔ وہاں علم، فرزانگی، ذہانت اور تجربہ وشعور سیاسی ان میں سے کس چیز کی کمی ہے۔ پھر دنیا میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے جو مادی وسائل وذرائع ہو سکتے ہیں ان میں سے کون سی چیز ہے جس کو یہاں آزما کر نہیں دیکھ لیا گیا ہو لیکن ان سب کا نتیجہ کیا ہے؟ عالمگیر امن قائم رکھنے کی ہر اجتماعی کوشش ایک ہولناک جنگ کا اعلان ثابت ہو رہی ہے۔ اور مغرب کی تمام ذہنی اور دماغی سربلندیاں انسانیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن کر رہ گئی ہیں، کیوں؟ محض اس لیے کہ دنیا کی پانچ عظیم الشان حکومتوں کی سیاست محض سیاست یا اپنے مادی اغراض کے لیے ہے اور اخلاقیات سے جن کا سرچشمہ مذہب اور خدا پر ایمان ہے۔ ان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ ہی وہ نکتہ ہے جس کو شاعر مشرق اقبال نے اس طرح بیان کیا تھا:

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا ۔۔۔ زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا ۔۔۔ اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

پس مادی طاقت وقوت کے ساتھ روحانیت، مذہبیت اور بے غل وغش اخلاقیات کا امتزاج، جو ہندوستان کی آب وگل کا اصلی جوہر ہے۔ اس ملک کا ایسا فخر اور ایک ایسا خصوصی امتیاز ہے جو نہ صرف ایشیاء کے لیے بلکہ تمام دنیا کے لیے ایک مینارۂ روشنی کا کام دے سکتا ہے۔ گاندھی جی اور حضرت شیخ الہند عصرِ جدید کی دو ایسی عظیم الشان اور بلند مرتبت شخصیتیں ہیں جن کا جواب صدیوں میں پیدا نہیں ہوسکتا، اور آج دنیا اپنے بڑے بڑے مفکروں، فلسفیوں اور روحانی پیشواؤں سمیت ان کی نظیر پیش کرنے سے یکسر عاجز ہے۔ پس غور کیجیے اگر سب ہندو مذہب اور سیاسیات میں گاندھی جی کے نقش قدم پر چلنے کا عزم صمیم کرلیں اور اسی طرح اس ملک کے مسلمان مذہب اور سیاست میں حضرت شیخ الہند کا مکمل اتباع اور پیروی کر کے اس شعر کا مصداق بن جائیں:

درکفے جامِ شریعت درکفے سندانِ عشق ۔۔۔ ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

تو کون کہہ سکتا ہے کہ افلاس وغربت کا مارا اور فرقہ وارانہ بغض وعناد کی بادِ سموم سے مرجھایا ہوا ملک باغِ ارم نہ

بن جائے گا۔ اور اقوام عالم کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ پیش نہ کرے گا۔ آج بدقسمتی سے ہمارے درمیان نہ گاندھی جی ہیں اور نہ حضرت شیخ الہند، لیکن ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے والے موجود ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی اور پنڈت لال جواہر نہرو دونوں ایک جگہ بیٹھ جاتے ہیں تو دونوں کے دل ایک دوسرے کی محبت اور عزت واحترام سے پُر ہو تے ہیں، شرافت ان کی بلائیں لیتی ہے اور انسانیت ان پر عقیدت وارادت کے پھول نچھاور کرتی ہے۔

جنگ آزادی کی ایک نمایاں خصوصیت: اس لائن پر ہندوستان کے مستقبل کا نقشہ بنانے سے قبل آپ ذرا ماضی پر ایک نگاہ ڈالیے، ہندوستان نے حکومتِ وقت کے خلاف بھی جنگ آزادی لڑی ہے اس کا سررشتہ چونکہ اخلاقیات کے ساتھ وابستہ تھا اس بناء پر یہ جنگ جہاں کامیاب ہوئی تو دوسری طرف اس نے ہندوستان کی اخلاقی عظمت وبرتری کا سکہ بھی دوسرے ملکوں پر قائم کر دیا، گاندھی جی اس جنگ کی رہنمائی کرتے وقت جو قدم اٹھاتے تھے تو پہلے اپنے ''دل کی اندرونی آواز'' جو ان کی اخلاقی حِس کی آواز ہوتی تھی اس سے مشورہ کر لیتے تھے۔ اسی طرح علماء جب اس راہ میں قدم رکھتے تھے تو وہ بھی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں رکھتے تھے اور چونکہ بنیادی اخلاقیات سب مذاہب میں تقریباً یکساں ہیں اس بناء پر دونوں قدم بقدم اور دوش بدوش چلتے تھے۔ چنانچہ یہ جنگ لڑنے کے لیے ترکِ موالات کا حربہ تجویز ہوا تو پانچ سو علماء نے قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کو اختیار کرنے کا فتویٰ دیا۔ سودیشی اور چرخہ کی تحریک چلی تو مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی نے شیخ جلال الدین سیوطی کا عربی رسالہ ''الاجرالجزل فی الغزل'' جس میں چرخہ کاتنے کی فضیلت اور سودیشی کی ضرورت ثابت کی گئی ہے اس کو مع ترجمہ کے چھاپا اور اس کے شروع میں جو مقدمہ تحریر کیا ہے اس میں لکھا:

> ''وہ لوگ جو چرخہ کی موجودہ تحریک پر یہ کہہ کر ہنستے ہیں اور قہقہہ لگاتے ہیں کہ ''یہ تو مسٹر گاندھی جی کی ایجاد کردہ تحریک ہے، مسلمان بھی ان کے پیچھے ہو لیے'' وہ یہ سمجھ لیں کہ جس چیز کو انہوں نے گاندھی جی کی ایجاد سمجھا ہے وہ درحقیقت ان کے گھر کی پرانی صنعت ہے۔ اس کی تعلیم ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرمائی تھی۔ جس چرخہ کو آج مسٹر گاندھی جی ہندوستان کے گھرانوں میں دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں، مدینہ کی گلیوں میں ہم اس کی آواز تیرہ سو سال پہلے سنتے ہیں۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کو اس وقت ذرا غیرت کرنا چاہیے اور مسٹر گاندھی جی کا احسان ماننا چاہیے کہ وہ ان کو مذہبی احکام یاد دلاتے ہیں''۔

(چرخہ کی فضیلت، چوتھا ایڈیشن، مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ، ص:۳)

ایک دلچسپ وسبق آموز واقعہ: علاوہ بریں ان معاملات میں خود گاندھی جی کی افتادِ طبع یہ تھی کہ وہ جب کوئی اقدام کرتے تھے تو اپنے دل کی آواز کے علاوہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ جو وہ کام کرنے والے ہیں اس کا سرا کہیں کسی پیغمبر کی تعلیم میں بھی ملتا ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں اس واقعہ کا ذکر دلچسپی اور سبق آموزی دونوں کا باعث ہوگا کہ ۱۹۳۰ھ میں جب انہوں نے قانون نمک کی خلاف ورزی کے لیے میلوں کا پیادہ پا سفر کر کے نمک بنانے کی مہم شروع کی اور اس میں جمعیۃ العلماء اور مسلمانوں نے دل کھول کر حصہ لیا، تو اس زمانہ میں راقم الحروف حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ اور ان کی جماعت کے ساتھ ڈابھیل ضلع سورت میں مقیم تھا۔ اس سفر کے سلسلہ میں گاندھی جی ڈابھیل سے چند میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں سے جس کا نام اب یاد نہیں رہا گذرنے والے تھے ہم لوگوں کو یہ اطلاع ہوئی تو سینکڑوں مقامی مسلمانوں کے ساتھ برادر محترم مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے بھی اس گاؤں میں پہنچ کر گاندھی جی کے درشن اور ان سے ملاقات کا ارادہ کرلیا۔ ہر چند کہ اس زمانہ میں راقم الحروف کا ''مجموعۂ خیال ابھی ابھی فرد تھا'' تاہم بانیِ تحریک سے عقیدت اور تحریک کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ جوش زن تھا، میں بھی ان دونوں کے ساتھ ہولیا۔ اللہ اکبر آج اس واقعہ کو (۱۹) سال ہونے کو آئے لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے کہ کل کی بات ہے۔ یہ ایک بہت معمولی اور چھوٹا سا گاؤں تھا لیکن اس روز جنگل میں منگل ہو رہا تھا انسانوں کا ایک سمندر تھا جو وہاں اُبل پڑا تھا۔ دوپہر کے بارہ بجے کے قریب گاندھی جی اس مقام پر کوچ کرتے ہوئے پہنچے، دس گیارہ میل کی مسافت پا پیادہ طے کر کے آئے تھے مگر کیا مجال کہ تھکن اور تعب کا کا اثر ذرا بھی نمایاں ہو۔ جسم میں وہی چستی، مستعدی، چہرہ پر وہی مسکراہٹ اور مخلصانہ سنجیدگی، نگاہوں میں وہی عزم وہمت اور استقلال وحوصلہ کی چمک، پیشانی پر وہی عالی ظرفی اور فراخ دلی کی بشاشت اور تر وتازگی، آتے ہی اپنی قیام گاہ میں داخل ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ملاقات کے کمرہ میں آ کر بیٹھے تو ہم تینوں نے ان کو اپنی آمد کی اطلاع کرائی فوراً اندر بلا لیا اور باوجود اس کے کہ لوگوں نے ان کو گھیر رکھا تھا اور وہ چرخہ چلانے کے ساتھ ساتھ ہر ایک سے گفتگو بھی کرتے جاتے، خطوط لکھواتے جاتے اور ورکرز کو ہدایات بھی دیتے جاتے تھے۔

ہمارے بیٹھتے ہی ہم سے مخاطب ہوگئے خیریت دریافت کی۔ دیوبند اور ڈابھیل کے مدرسوں کے حالات پوچھے اور پھر فوراً بولے ''میں نے کسی اخبار میں پڑھا ہے کہ مولانا انور شاہ صاحب نے اپنی کسی حال کی ہی تقریر میں ایک

حدیث کا ذکر کیا ہے جس میں پیغمبر صاحب نے فرمایا ہے کہ تین چیزوں پر ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا پانی، گھاس اور نمک'' تو کیا یہ واقعہ صحیح ہے اور ایسی کوئی حدیث موجود ہے۔ ہماری طرف سے مولانا محمد حفظ الرحمٰن نے اثبات میں جواب دیا اور کہا ''ایک حدیث جس میں پانی اور گھاس کا ذکر ہے وہ تو عام کتابوں میں بھی ہے۔ البتہ ہمارے استاد نے ایک اور سند سے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس میں نمک کا لفظ بھی ہے''۔ گاندھی جی سن کر بڑے خوش ہوئے جیسے انہیں کوئی ایسی چیز مل گئی ہو جس کی انہیں دیر سے جستجو تھی اور فرمایا ''تو مولوی صاحب! مجھ کو اب بڑی تقویت ہو گئی۔ آپ جب ڈابھیل واپس لوٹیں تو میں ایک اپنا آدمی آپ کے ساتھ کر دوں گا آپ مہربانی فرما کر حدیث کو مع اس کی سند اور کتاب وصفحہ کے حوالہ کے اصل عربی الفاظ اور اردو ترجمہ کے ساتھ نقل کر کے اس کو دے دیں، میں بڑا شکر گزار ہوں گا۔ چنانچہ یہ شخص ہمارے ساتھ آیا اور یہ حدیث نقل کر کے لے گیا۔

پس ہندوستان کی جنگ آزادی کے سب سے بڑے ہیرو اور قائد (گاندھی جی) کا اور ساتھ ہی علمائے ہند کا سیاسی تحریک کو مذہبی اخلاقیات کی روشنی میں چلانا اور پروان چڑھانا ہندوستان کا ایک ایسا طغرائے امتیاز ہے جو اس کو دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں سرفراز و سربلند کر دیتا ہے اور جو اپنی خصوصیت کے باعث مادیت کی اس تیرۂ و تار دنیا میں ایک مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پچھلے دنوں ملک میں مذہب کے نام پر جو قتل و غارتگری کی گرم بازاری ہوئی اس نے مذہب کو رسوا اور خوار کر دیا ہے اور ہندوستان کی عظمتِ دیرینہ کی پیشانی پر ایک ایسا داغ لگا دیا ہے جو مشکل سے ہی مٹ سکتا ہے لیکن اس کا الزام مذہب کے سر لگانا انتہا درجے کی بے عقلی ہے۔ مذہب کی مثال تو ایک تلوار جیسی ہے جس کی اہمیت اور ضرورت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اگر کوئی پاگل سجرانِ جنون کے عالم میں اس سے خود اپنی یا اپنے کسی ساتھی کی گردن کاٹ دے تو کیا اس کے لیے تلوار کو موردِ الزام قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہاں! اس میں شبہ نہیں پچھلے دنوں مذہب کی یہ تلوار ناکردہ گناہ انسانوں کے خون سے رنگین ہو کر بہت کچھ بدنام ہو چکی ہے لیکن اگر مذہب کا مقصد انسانیت کی خدمت کرنا، زمین سے شر و فساد کا قلع قمع کرنا، ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کی حمایت و دادرسی کرنا اور اپنا ہر کام خالقِ کائنات کی مرضی اور اس کے حکم کے مطابق انجام دینا ہے تو آج ہر شمشیر زن کا فرض ہے کہ وہ مذہب کی تلوار کو اس کے صحیح مقصد و منشا میں استعمال کر کے اس پر سے بے گناہوں کے خون کے دھبے مٹا دے اور اس کی بدنامی کو نیک نامی سے تبدیل کر دے۔ آخری قیام دہلی کے دوران ایک مرتبہ گاندھی جی نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ اب جبکہ ہندوستان

آزاد ہو گیا ہے تو ہندو مذہب اور اسلام دونوں کے لیے آزمائش کا وقت ہے، دونوں کو یہ بتانا ہوگا کہ وہ انسانی فلاح و بہبود کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ ہاں بیشک اب وہ وقت آ گیا ہے اور بحیثیت مسلمان ہونے کے اس حقیقت کا اعلان کرتے ہوئے ہمیں فخر محسوس ہوتا ہے کہ مذاہب کے اس دورِ ابتلا و آزمائش میں اسلام وہ سب کچھ پیش کر سکتا ہے جو انسان کی روحانی، اخلاقی اور مادی زندگی کے ہر پہلو کو آسودہ و خوشحال کرنے کے لیے ضروری ہے اور جس کے بغیر انسانیت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

مذہبی تحریکات میں بھی ہندو، مسلمانوں کا اشتراک: چونکہ گاندھی جی اور علمائے کرام کی متفقہ سیاسی جدوجہد کی بنیاد باہمی رواداری اور مذہبی اخلاقیات پر تھی جنہوں نے ہندو مسلمانوں کو اختلافِ مذہب کے باوجود ایک دوسرے کے درد و غم میں شریک اور معاون بنا دیا تھا اس بناء پر بعض ایسی تحریکیں جو خالص مذہبی تھیں اور جن کا تعلق اس ملک سے نہیں تھا ان میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک ساتھ نظر آتے تھے۔ مثلاً تحریک خلافت صرف مسلمانوں کی تحریک تھی اور اس کی بنیاد صرف وہ مذہبی رشتہ تھا جو مسلمانان ہند ترکوں کے ساتھ رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود جن لوگوں نے ۱۹۲۰ء کا زمانہ دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس تحریک میں ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کا کیسا ساتھ دیا۔ مسلمان اس کو بھی اچھی طرح محسوس کرتے تھے اور اپنے برادرانِ وطن کے شکر گزار تھے، چنانچہ مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم دیوبندی جو مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، بانی دارالعلوم دیوبند کے صاحبزادہ اور مدرسہ کے صدر مہتمم تھے، اپنے ایک خطبہ میں اس طرح اس کا اعتراف کرتے ہیں:

> ''میں نے اپنے ہم وطن معاونوں کا جن میں ہندو اور سکھ مذہب سب داخل ہیں۔ شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے بلا خیال اختلاف مذہب مسلمانوں کے خالص مذہبی معاملات میں ہمدردی کی ہے اور نہ صرف زبانی ہمدردی بلکہ عملی شرکت کر کے اپنے آپ کو موردِ الزام بنایا ہے اور ملکی معاملات میں ہر قسم کی رواداری اور بلند نظری کے لیے آمادہ ہیں''۔
>
> (خطبۂ صدارت، اجلاس جمعیۃ علمائے روہیل کھنڈ، منعقدہ ۱۴؍ دسمبر ۱۹۲۰ء، ص:۱۰)

مولانا طفیل احمد صاحب اس زمانہ کے متعلق اپنے تاثر کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں:

> ''خلافت کانفرنس کا اجلاس اگرچہ صرف مسلمانوں سے مخصوص تھا مگر اس وقت وہ عجیب معجون مرکب بن گیا تھا اس سلسلے میں ہندو اور مسلمان یکساں جوش کے ساتھ شریک تھے''۔

اسی سلسلہ میں ایک اور جلسہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خلافت کانفرنس کا اجلاس ۲؍ جنوری ۱۹۲۱ء کو بمقام ناگپور بصدارت مولانا عبدالماجد بدایونی منعقد ہوا کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی وہیں ہوئے تھے۔ سب سے پہلی تحریک پنڈت رام بھجدت چودھری نے پیش کی جس کا منشا یہ تھا کہ جب تک خلافت کا مسئلہ طے نہ ہو صلح کی شرائط کی مخالفت کی جائے اور اپنی تقریر میں بیان کیا کہ خلافت کے مسئلہ میں ہندو برابر ساتھ رہیں گے۔ ڈاکٹر راجکمار چکرورتی (ڈھاکہ) نے اس تجویز کی تائید کی جو پاس ہوئی!!

(روشن مستقبل، ص: ۵۱۶)

صرف مذہبی آزادی: اس بحث کے آخر میں اس امر کی طرف بھی توجہ دلانا موضوع کی بحث کی اصل روح کو اجاگر کرنے کا سبب ہوگا کہ جب تک کانگریس میں رجعت پسند طبقہ کے اثر ورسوخ کی وجہ سے مسلمان چوکنے نہیں ہوئے تھے اور آزادی کے بعد حقوق کی تعین وتشخیص کی کشمکش پیدا نہیں ہوئی تھی، علماء نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں پیش پیش رہنے کے باوجود اس زمانہ میں اگر کسی چیز اور اپنے کسی مطالبے کا اظہار کیا تو وہ صرف مذہبی آزادی تھی یعنی یہ کہ ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے بعد مسلمان اپنے مذہبی معاملات میں بالکل آزاد ہوں گے اور مذہبی آزادی سے مراد یہ تھی اور ہے کہ جو چیزیں فرض واجب اور مستحب ہیں ان کی بجا آوری وہ اسی طرح کریں گے اور جو چیزیں مباح ہیں ان کا کرنا نہ کرنا برابر ہے وہ اسی طرح رہیں گے۔ مثلاً گاؤکشی نہ فرض ہے اور نہ واجب مسلمانوں کا اختیار ہے کہ گائے کا گوشت کھائیں یا نہ کھائیں تو مباحات میں آزادی کا مقصد یہ تھا کہ ان چیزوں کے اخذ اور ترک کرنے یا نہ کرنے کا دارومدار صرف مسلمانوں پر ہوگا۔ اگر وہ خود کسی بڑی اور اہم مصلحت کے باعث اس کو ترک کرنا چاہیں تو اپنے جماعتی فیصلہ کے ذریعہ ایسا کر سکتے ہیں لیکن ملک کی حکومت کو جس میں بہرحال اکثریت غیر مسلموں کی ہوگی اس کو ہرگز یہ حق نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کے جماعتی فیصلہ کے بغیر کسی مباح کو واجب یا ممنوع قرار دے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ اگر علماء کی سیاسی جدوجہد انگریزوں کے خلاف اسی مذہبی آزادی کو حاصل کرنے کے لیے تھی۔ تو یہ آزادی تو مسلمانوں کو انگریزی راج میں بدرجۂ اتم حاصل تھی۔ نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ جمعہ کے روز نماز کے وقت مسلمان ملازمین کو سرکاری نماز کے لیے چھٹی ملتی تھی۔ حج کے لیے بآسانی رخصت مل جاتی تھی اور پروویڈنٹ فنڈ سے یا پنشن سے روپیہ بھی مل جاتا تھا۔ گاؤخوری پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ عدالتوں میں جج خالص اسلامی قوانین نکاح وطلاق کے

مطابق فیصلے کرتے تھے۔ترکہ کی تقسیم اسلامی وراثت کی روشنی میں ہوتی تھی۔پھر آخر وہ کون سی مذہبی آزادی تھی جس کو حاصل کرنے کے لیے علماء بے تاب تھے؟

بات دراصل یہ ہے کہ ''مذہبی آزادی'' سے علماء کی مراد ایک تو یہ تھی کہ برطانوی شہنشاہیت پر ضرب کاری لگائی جائے تا کہ ممالک اسلامیہ انگریزوں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے جس اصل آزادی سے محروم ہیں انہیں وہ مل جائے اور ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کی صورت میں مسلمان جو اپنے مذہبی احکام کے خلاف انگریزی فوج میں داخل ہوکر خود مسلمان حکومتوں سے لڑنے جاتے ہیں یہ سلسلہ ختم ہو اور مسلمانوں پر یہ جبر نہ ہو سکے علاوہ بریں علماء کی مراد مذہبی آزادی سے ''مذہبی آزادی زیر حکومت وطنی'' تھی انگریزوں نے جو مذہبی آزادی دے رکھی تھی وہ کیسی ہی کچھ ہو تاہم غیر کی دی ہوئی آزادی تھی اور کسی دوسرے کے پاؤں سے جنت میں داخل ہونے کا حکم رکھتی تھی۔علماء بحیثیت سچے محبّ وطن ہونے کے اس کو غیرت کے خلاف سمجھتے تھے۔

تحریک شیخ الہند پر ایک اعتراض: یہاں تک کہ ہم نے جو کچھ بیان کیا اس کا مقصد صرف تحریک شیخ الہند کا اصل منشاو مقصد اور اس کی اصل اسپرٹ پر روشنی ڈالنا تھا۔اب رہی یہ بات کہ یہ تحریک کس طرح چلائی گئی؟ ہندوستان کی سیاسی جدوجہد اور کانگریس پر اس کے کیا اثرات ہوئے؟ ملک کی بیداری کرنے میں اس تحریک کو کیا دخل ہے؟ اور اس تحریک کے علمبرداروں نے کس طرح اپنے مقصدِ عظیم کی خاطر عظیم الشان قربانیاں پیش کیں؟ اب آئندہ صفحات میں ہم اس پر روشنی ڈالیں گے۔لیکن اس موقعے پر اتنا اور جتا دینا ضروری ہے کہ بعض لوگ اس تحریک کو غیر آئینی کہہ کر اس پر اعتراض کرتے ہیں ان سے یہ دریافت کرنا چاہیے کہ ۱۹۴۲ء میں کانگریس کی تحریک ''ہندوستان چھوڑ دو'' اور اس سے قبل بیسویں صدی کے پہلے عشرہ میں تقسیم بنگال کو منسوخ کرانے کی تحریک یہ دونوں بھی غیر آئینی تحریکیں تھیں یا نہیں؟ اگر تھیں تو جو دلائل آپ ان کے جواز میں پیش کریں گے وہی ہماری طرف سمجھیے ، پھر تحریک شیخ الہند اندرون ہند اور بیرون ہند اس طرح چلی کہ خود اس تحریک کے علمبرداروں نے دنیا بھر کی مصیبتیں ، سختیاں ، اور سزائیں اُٹھائیں لیکن جس قوم کے خلاف یہ تحریک تھی اس کے کسی ایک فرد کی بھی نکسیر نہیں پھوٹی ، اگر ایسا ہوتا تو کوئی عجوبہ بات نہ ہوتی۔کیونکہ ''تنگ آمد بجنگ آمد'' دنیا کا پرانہ مقولہ ہے۔

(باقی آئندہ)
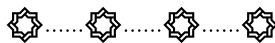
مولانا الطاف حسین حالی رحمۃ اللہ علیہ

بابائے اُردو مولوی عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ

مولانا الطاف حسین حالی، اپنے دور کے مسلّم الثبوت شاعر اور نقاد تھے۔ وہ اپنے زمانہ کے ادبی مجدد تھے۔ جنہوں نے ملک کے بگڑے ہوئے ادبی مذاق کو درست کیا، سدھارا، سنوارا اور اردو ادب کو پستی سے نکال کر بلندی کی راہ دکھائی۔ ان کی نظمیں ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر تھیں۔ دادھیال ان کا انصاری اور ننھیال سادات کے ایک معزز گھرانے میں تھا۔ آپ کی ولادت پانی پت میں ۱۲۵۳ھ میں ہوئی۔ ولادت کے بعد ان کی والدہ صاحبہ دماغی مریض ہوگئیں، جب ۹ سال کے ہوئے تو والد صاحب نے رحلت کی، اس وجہ سے تعلیم و تربیت کا جیسا انتظام ہونا چاہیے تھا، وہ ان کو میسر نہیں ہوا۔

قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد اپنے شوق سے سید جعفر علی سے کچھ فارسی پڑھی، اس کے بعد مولوی ابراہیم حسین انصاری سے عربی شروع کی، دلّی میں مولوی نوازش علی مرحوم سے صرف و نحو اور منطق کی کتابیں پڑھیں۔

اس کے علاوہ مولوی محبّ اللہ، مولوی قلندر علی اور مولوی عبدالرحمٰن محدث سے کتب تفسیر و حدیث اور منطق و فلسفہ کا درس لیا۔

جس زمانہ میں دلّی میں تحصیل علم کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے، ان کو اکثر مرزا اسداللہ خان غالب کے پاس جانے کا اتفاق ہوتا تھا، ان کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے اُن کے معنی ان سے پوچھا کرتے تھے، اسی زمانہ میں مرزا غالب نے اپنے فارسی دیوان کے چند قصیدے بھی ان کو پڑھا دئے تھے، مرزا غالب کی عادت یہ تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر سے منع کرتے تھے، حالؔی نے جو دو ایک اردو یا فارسی کی غزلیں کہہ کر مرزا کو دکھائیں، تو انہوں نے کہا کہ میں اگرچہ کسی کو شعر کہنے کی صلاح نہیں دیتا مگر تمہاری نسبت میرا خیال یہ ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔

بعد ازاں نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ رئیس جہانگیر آباد سے شناسائی ہوگئی، جب ان کی مصاحبت میں رہنے کا موقع ملا تو ذوق شعر و سخن کو مزید تازگی ملی۔

گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت میں جب کہ ان کو انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابیں درست کرنی پڑتی تھیں تو رفتہ رفتہ ان کو انگریزی خیالات اور انگریزی طرزِ ادا سے ایک خاص مناسبت پیدا ہوگئی۔

اسی زمانہ میں سر سید احمد خان مرحوم نے ان کو ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کے موجود تنزل اور پستی کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو بہت مفید ہوگی، انہوں نے ان کی تحریک پر ''مسدس مدوجزر اسلام'' لکھا، جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے۔

آخر عمر میں ایک حصہ اپنے عربی کلام کا شائع کیا، اُردو کا دیوان جب مرتب کیا تو اردو شاعری پر ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر اس میں شامل کر دیا، جو دیکھنے کے قابل ہے اور اردو زبان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے۔ اس کے مطالعہ سے مولانا حالی کے مذاقِ شاعری کا صحیح

اندازہ ہوسکتا ہے۔
ان کی مشہور تصنیف ''حیات سعدی'' ہے جس میں شیخ سعدی شیرازی کے حالات زندگی لکھے ہیں اور ان کی نظم ونثر پر نہایت عمدگی اور خوبی سے تنقید کی ہے۔ یہ کتاب 1881ء میں شائع ہوئی۔
ایک کتاب ''یادگار غالب'' ہے۔ اس میں مرزا غالب کے حالات زندگی تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کے فارسی وار دو اشعار کا انتخاب بھی شامل کر دیا ہے۔ یہ کتاب 1896ء میں شائع کی۔
ایک کتاب ''حیات جاوید'' ہے جس کے 877 صفحات ہے۔ اس میں انہوں نے سرسید مرحوم کے حالات زندگی لکھے ہیں اور ان کی تمام حیثیتوں پر مورخانہ وفلسفیانہ بحث کی ہے۔ یہ کتاب 1901ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔
نثر میں تنقید کے علاوہ سیرت نگاری حالیؔ کا خاص میدان ہے، یہاں بھی انہوں نے وہی مجددانہ شان دکھائی جس نے شعر اور تنقید کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ مولانا حالیؔ نے سیرت نگاری کا نیا ڈھنگ اختیار کیا، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ جس شخص کی سیرت لکھی جاتی ہے اس کے ذاتی حالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کا تعلق اس زمانے سے کیا تھا جس میں وہ پیدا ہوا، اس کے کام کی کیا قدر و قیمت ہے، کام کا اثر اس کی زندگی پر اور زندگی کا اثر اس کے کام پر کیا پڑا۔ حالیؔ نے یہ تینوں کتابیں اسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھیں۔
مولانا الطاف حسین حالیؔ کا انتقال ۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ کو ہوا۔
قارئین ''الحامد'' کی معلومات میں اضافہ کے لیے ہم نے یہ مختصر سا نوٹ تحریر کیا ہے۔ اب بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مولانا حالیؔ پر مضمون ملاحظہ فرمائیں جو 1937ء میں تحریر کیا گیا۔ یہ مضمون ان کی کتاب ''چند ہم عصر'' کے نمبر 159 پر شائع ہوا ہے۔
(محمد اورنگ زیب اعوان)

حالیؔ

غالباً ۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء کا ذکر ہے جب میں مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ میں طالب علم تھا۔ مولانا حالی اس زمانہ میں یونین کے پاس بنگلیا میں مقیم تھے۔ میں ان تعطیلوں کے زمانے میں وطن نہیں گیا۔ اور بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہا۔ اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں ''حیاتِ جاوید'' کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ یادگارِ غالب کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔ انہیں دنوں میں ایک عزیز میرے ہاں مہمان تھے۔ میں جو ایک دن مولانا کے ہاں جانے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ ہو لئے کچھ دیر مولانا سے بات چیت ہوتی رہی۔ لوٹتے وقت رستے میں مہمانِ عزیز فرمانے لگے کہ ملنے اور باتوں سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی مولوی حالی ہیں جنہوں نے ''مسدس'' لکھا ہے۔ یہ مولانا کی فطری سادگی تھی جو اس خیال کا باعث ہوئی۔
ایک دوسرا واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا ذکر

ہے جب کہ غفران مآب اعلیٰ حضرت کی جوبلی بلدۂ حیدرآباد اور تمام ریاست میں جو بڑے جوش اور شوق سے منائی جارہی تھی۔ مولانا حالی بھی اس جوبلی میں سرکار کی طرف سے مدعو کئے گئے تھے اور نظام کلب کے ایک حصے میں ٹھیرائے گئے۔ زمانۂ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام تک ان سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدرآباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے زینے کے قریب اُترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کی یہ حضرت اس ذراسی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر اس غریب کے رسید کر دئے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے، مولانا سے ملے، مزاج پُرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے ''ہائے ظالم نے کیا کیا'' اس روز وہ کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی، وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے کہ ''یہ معلوم ہوتا ہے گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔'' اِس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔

مولانا کی سیرت میں دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی دوسری درد دِل۔ اور یہی شان ان کے کلام میں ہے۔ ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے یا یوں سمجھئے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔ مجھے اپنے زمانے کے بعض نامور اصحاب سے اور اپنی قوم کے اکثر بڑے بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ نواب عماد الملک فرمایا کرتے تھے کہ سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے مولانا حالی کا پایہ بہت بلند تھا۔ اس بات میں سرسید بھی نہیں پہنچتے تھے۔ جن لوگوں نے انہیں دیکھا ہے یا جو اُن سے ملے ہیں۔ وہ ضرور اس قول کی تصدیق کریں گے۔

خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ اس قدر بڑے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے جھک کر اور خلوص سے ملتے تھے جو کوئی ان سے ملنے آتا خوش ہو کر جاتا اور عمر بھر اُن کے حسن اخلاق کا مداح رہتا تھا۔ ان کا رتبہ بہت بڑا تھا مگر انہوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے سے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔ طالبِ علمی کے زمانے میں ایک بار جب وہ علی گڑھ میں مقیم تھے میں اور مولوی حمید الدین مرحوم ان سے ملنے آ گئے تو سروقد تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ہم اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوئے مولوی حمید الدین نے

کہا بھی کہ آپ ہمیں تعظیم دے کر محجوب کرتے ہیں۔ فرمانے لگے'' آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں، آیندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔''

اس سے بڑھ کر خاکساری کا کیا ثبوت ہوگا کہ انہوں نے اپنی کتابوں کا جو اصلی اور حقیقی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں۔ ہمیشہ ''مرتبہ'' لکھا ''مؤلفہ'' یا ''مصنفہ'' کا لفظ نہ لکھا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے مشہور، سفیر مولوی انوار احمد مرحوم کہتے تھے کہ ایک بار وہ پانی پت گئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے مولانا مکان پر پہنچے۔ دالان کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے پردہ اٹھایا اور جھانک کر دیکھا۔ مولوی صاحب فرش پر بیٹھے تھے اور سامنے آگ کی انگیٹھی رکھی تھی۔ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اُٹھ کر ملے اور اپنے پاس بٹھالیا۔ مزاج پرسی کے بعد کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد کھانا منگوایا۔ انوار احمد مرحوم کھانے کے بہت شوقین تھے پانی پت کی ملائی بہت مشہور ہے ان کے لیے منگوائی۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ وقت بات چیت میں گزرا۔ پھر ان کے لیے پلنگ بچھوا کر بستر کر دیا اور خود آرام کرنے کے لیے اندر چلے گئے۔ یہ بھی تھکے ہوئے تھے پڑ کر سو رہے۔ مولوی نور احمد کہتے تھے کہ رات کے بارہ بجے انہیں ایسا محسوس ہوا کہ کوئی شخص رزائی کو آہستہ آہستہ سے چھو رہا ہے۔ انہوں نے چونک کر پوچھا کہ کون؟ مولوی صاحب نے کہا کہ میں ہوں۔ آج سردی زیادہ ہے مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کے پاس اوڑھنے کا سامان کافی نہ ہو تو کمبل لایا تھا اور آپ کو اُڑھا رہا تھا۔ انوار احمد کہتے تھے کہ مجھ پر ان کی اس شفقت کا ایسا اثر ہوا کہ عمر بھر نہیں بھول سکتا۔

مہمان کے آنے سے (اور ایسا اکثر ہوتا تھا) وہ بہت خوش ہوتے تھے اور سچے دل سے خاطر تواضع کرتے تھے اور اس کے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا بہت ہی رقیق القلب تھے۔ دوسرے کی تکلیف کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے اور جہاں تک اختیار میں ہوتا اس کے رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حاجت مندوں کی حاجت روا کرنے میں بڑی فراغ دلی سے کام لیتے تھے۔ باوجودیکہ ان کی آمدنی قلیل تھی، لیکن اپنے پرائے خصوصاً مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ سفارشیں کر کے کام نکالتے تھے۔ اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ بامروت ایسے تھے کہ انکار نہیں کرتے تھے۔ اس قلیل آمدنی پر بھی حاجت مندان کے ہاں سے محروم نہیں جاتے تھے۔

تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم وملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے

بڑے حامی تھے۔ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے تو انہیں بہت رنج اور افسوس ہوتا تھا۔ تحریر و تقریر میں کیا نج کی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کبھی کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا جو کسی فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہتا تو بہت بُرا مانتے اور نصیحت کرتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف ان ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔

ہندوی اردو کا جھگڑا ان کے زمانے میں پیدا ہو چکا تھا اور اس نے ناگوار صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن باوجود اس کے کہ انہوں نے بھی عمر بھر اردو کی خدمت کی اور اپنی تحریروں سے اُردو کا رتبہ بہت بلند کر دیا۔ وہ انصاف کی بات کہنے سے کبھی نہ چوکے، چنانچہ خمخانۂ جاوید کے تبصرے میں لکھتے ہیں:

''آج کل اہل ملک کی بدقسمتی سے جو اختلافات ہندو مسلمانوں میں اُردو زبان کی مخالفت یا اس کی حمایت کی وجہ سے برپا ہے اس کی رفع داد ہو سکتی ہے تو اس طریقہ سے ہو سکتی ہے کہ ہندو تعلیم یافتہ اصحاب کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اُردو زبان میں جو درحقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت اور اس کی ایک پروان چڑھی اولاد ہے اس طرح تصنیف و تالیف کریں جس طرح ہر دل عزیز ہیرو نے اس طولانی تذکرے کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے اور مسلمان مصنفین بے ضرورت اردو میں عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہو سکے پرہیز کریں اور ان کی جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اُردو کو مالا مال کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس طرح دونوں قوموں میں آشتی اور صلح کی بنیا دڈالیں اور ایک متنازعہ فیہ زبان کو مقبولۂ فریقین بنائیں۔ جیسی کہ لکھنؤ جانے سے پہلے تقریباً اہل دلّی کی زبان تھی۔ مذکورہ بالا اختلاف کے متعلق جو تعصب اور ناگواری کا الزام ہندوؤں پر لگایا جاتا ہے اس قسم کا بلکہ اس سے زیادہ سخت الزام مسلمانوں پر لگایا جا سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک ہزار برس سے ہندوستان میں آباد ہیں مگر اس طویل مدت میں انہوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف باوجود سخت ضرورت کے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ جس سنسکرت کو یورپ کے محقق لاطینی و یونانی سے زیادہ فصیح، زیادہ وسیع اور زیادہ باقاعدہ بتاتے ہیں اور جس کی تحقیقات میں عمر بسر کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں نے عام طور پر کبھی اس کو قابلِ التفات نہیں سمجھا اگر یہ کہا جائے

کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا جو بمقابلے سنسکرت کے نہایت سہل الحصُول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف، شگفتہ اور فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے اس کو بھی عموماً بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے حالانکہ جو اُردو ان کو اس قدر عزیز ہے اس کی گریَمر کا دارومدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گرامر پر ہے عربی فارسی سے اس کو صرف اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبانوں کے اسما اس میں کثرت سے شامل ہو گئے ہیں باقی تمام اجزائے کلام جن کے بغیر کسی زبان کے نثر و نظم مفیدِ معنی نہیں ہوسکتی۔ برج بھاشا یا سنسکرت کی گریَمر سے ماخوذ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم از کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا بالکل اپنے تئیں اس مثل کا مصداق بنانا ہے کہ ''دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیَر۔''

یہ بات بعض لوگوں کو ناگوار گزری اور بعض اردو اخباروں نے اس کی تردید بھی چھاپی لیکن جو سچی بات تھی وہ کہہ گزرے۔ اس خیال کا اظہار انہوں نے کئی جگہ کیا ہے کہ جو شخص اُردو کا ادیب اور محقق ہونا چاہتا ہے، اُسے سنسکرت یا کم سے کم ہندی بھاشا کا جاننا ضروری ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری میں ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

''اردو زبان پر قدرت حاصل کرنے کے لیے صرف دلی یا لکھنو کی زبان کا اتباع ہی کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ اردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسما کا ہندی سے ماخوذ ہے اور اُردو شاعری کی بنا پر جو عربی شاعر سے مستفا ہے قائم ہوئی ہے۔ نیز اردو زبان میں بڑا حصہ اسما کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ پس اُردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی و فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے اور جو عربی فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسے پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے وہ ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔''

ایک بار جو اُردو لغت کی ترتیب کا ذکر ان سے آیا تو فرمانے لگے کہ اردو لغات میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال

میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلا تکلف کثرت سے داخل کرنے چاہئیں۔خود اپنی نظم ونثر میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوبصورتی سے لکھ جاتے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اسی موقع کے لیے وضع ہوئے تھے۔انہوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اردو ادب میں داخل کیے جو ہماری نظر سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کبھی کسی اردو ادیب یا شاعر نے کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اُٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے۔ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی حالؔی سے سیکھے۔دلوں میں گھر کر لینے کے جو گُر ادب میں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

نام ونمود چھو کر نہیں گیا تھا ورنہ شہرت وہ بَد بلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے۔ہمارے شاعروں میں تو تعلّی عیب ہی نہیں رہی بلکہ شیوہ ہوگئی ہے۔وہ سیدھی سادی باتیں کرتے تھے اور جیسا کہ عام طور پر دستور ہے باتوں باتوں میں شعر پڑھنا بحث کر کے اپنی فضیلت جتانا یا اشارے کنایے میں دوسروں کی تحقیر اور در پردہ اپنی بڑائی دکھانا ان میں بالکل نہ تھا۔ہاں شعر میں البتہ کہیں کہیں تعلّی آ گئی ہے مگر وہ بھی ایسے لطیف پیرایے میں کہ خاکساری کا پہلو وہاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں پایا،مثلاً:

ے گرچہ حالؔی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دوچار ہیچ

یا

ے مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالؔی نے دکان سب سے الگ

ان کا ذوقِ شعر اعلا درجے کا تھا۔جیسا کہ حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور مقدمہ شعروشاعری سے ظاہر ہے۔اور حقیقت یہ ہے۔صحیح ذوق پیدا کرنے میں انہوں نے بڑا کام کیا ہے لیکن وہ خواہ مخواہ اس کی نمائش نہیں کرنا چاہتے تھے، ہاں جب کوئی پوچھتا یا اتفاق سے بات آ پڑتی تو وہ کھل کر اس کے نکات بیان کرتے تھے۔

ہمارے ہاں یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ جب کبھی کوئی کسی شاعر سے ملتا ہے تو اس سے اپنا کلام سُنانے کی فرمائش کرتا ہے۔شاعر تو شاعر سے اس لیے فرمائش کرتا ہے کہ اسے بھی اپنا کلام سنانے کا شوق گدگداتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کا مخاطب

بھی اس سے یہی فرمائش کرے گا۔اور بعض اوقات تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی بغیر فرمائش ہی اپنے کلام سے محظوظ فرمانے لگتے ہیں، دوسرے لوگ اس لیے فرمائش کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ شاعر ان سے اس کی توقع رکھتا ہے (بعض شاعر تو اس کے لیے بے چین رہتے ہیں۔) لیکن بعض لوگ سچے دل سے اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ کسی بڑے شاعر کا کلام بھی اس کی زبان سے سُنیں۔لوگ مولانا حالؔی سے بھی فرمائش کرتے تھے۔وہ کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے تھے اور اکثر یہ عذر ِلنگ ہی نہ تھا اس میں کچھ حقیقت بھی تھی لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ خودنمائی سے بہت بچتے تھے۔ جن دنوں مولانا حالی کا قیام حیدرآباد میں تھا۔ایک دن گرامی مرحوم نے چائے کی دعوت کی چند اور احباب کو بھی بلایا، چائے وغیرہ کے بعد جیسا کہ معمول ہے فرمائش ہوئی کہ کچھ کلام سنائیے۔مولانا نے وہی حافظے کا عذر کیا۔ ہر چند لوگوں نے کہا کہ کچھ بھی یاد ہو فرمائیے مگر مولانا عذر ہی کرتے رہے اتنے میں ایک صاحب کو خوب سوجھی، وہ چپکے سے اُٹھے اور کہیں سے ''دیوان حالؔی '' لے آئے اور لا کے سامنے رکھ دیا۔اب مجبور ہوئے کوئی عذر نہیں چل سکتا تھا۔آخرانہوں نے یہ غزل سنائی جس کا مطلع یہ ہے:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لَے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں اُن کا ذکر نہیں، لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں ان میں بعض طرح طرح سے چشم وابرو، ہاتھ، گردن اور دوسرے اعضاء سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے البتہ موقع کے لحاظ سے اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اس سے اثر پیدا ہوتا تھا۔ایک بار علی گڑھ کالج میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا، مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا انہوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لیے مولوی وحیدالدین سلیم صاحب کو دی، جو بلند آواز مقرر اور پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔سلیم صاحب ایک بند ہی پڑھنے پائے تھے کہ مولانا سے نہ رہا گیا نظم ان کے ہاتھ سے لے لی، اور خود پڑھنی شروع کی، ذرا سی دیر میں ساری مجلس میں کُہرام مچ گیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں)
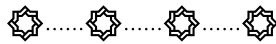
فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

محمد اورنگ زیب اعوان

گزشتہ شمارہ میں قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگردوں میں سے ایک نامور شاگرد حضرت مولانا سید احمد حسن امروہی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ قارئین ''الحامد'' کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔
آج حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے ایک اور ممتاز و نامور شاگرد کا تذکرہ پیش کیا جارہا ہے، ان کا نام نامی اسم گرامی ہے۔

''حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ''

آپ کی ولادت 1846ء کو دہلی میں ہوئی، 1857ء کی جنگ آزادی کے وقت آپ کی عمر گیارہ برس تھی آپ کے دادا شاہ حبیب اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سہارن پور کے رہنے والے تھے، اُن کی شادی قطب عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے سجادہ نشین حضرت شاہ عماد الاسلام کی صاحبزادی صاحبہ کے ساتھ ہوئی تھی اس لیے وہ سہارن پور سے گنگوہ تشریف لے گئے تھے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ کے صاحبزادہ شاہ عبدالرحمٰن مرحوم تھے، حضرت شاہ حسن عسکری مرحوم کی صاحبزادی سے آپ کا نکاح ہوا۔ شاہ حسن عسکری، حضرت شاہ غلام سادات دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے تھے۔
شاہ حسن عسکری، شاہ عبدالرحمٰن مرحوم کو اپنی سگی اولاد کی طرح چاہتے تھے، جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد شاہ حسن عسکری نے دہلی کو خیر باد کہا اور گنگوہ منتقل ہو گئے، جنگ آزادی کے تیسرے سال 1860ء میں گنگوہ ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔
حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت دہلی میں ہوئی تھی اور انہوں نے ابتدائی زندگی کے بارہ برس اپنے نانا اور والد کی زیر نگرانی گذارے اور یہیں سے انہوں نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز کیا، گنگوہ آنے کے بعد آپ نے قرآن مجید حفظ کیا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کئے۔ آپ نے حدیث کی ابتدائی کتابیں بھی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''تذکرۃ الرشید'' میں جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کی فہرست صفحہ نمبر ۱۹۷ پر دی ہے۔ اس میں ۳۵ نمبر پر مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ کا نام نامی موجود ہے۔
حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''سوانح قاسمی'' حصہ اوّل کے صفحہ نمبر ۷۴ پر لکھا ہے کہ:

''دوسرے مولوی فخر الحسن صاحب گنگوہی ہیں............انہوں نے بھی مدرسہ دیوبند میں تحصیل کی ہے اور اوّل جناب مولوی رشید احمد سے تحصیل کی تھی۔''

مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے درس حدیث کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ مجھے یونس علیہ السلام پر فضیلت نہ دو۔ جب یہ حدیث مبارکہ حضرت گنگوہی کے درس میں آئی تو طلباء نے اپنے اشکال بیان کیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو حضرت یونس علیہ السلام بلکہ تمام انبیاء کرام سے یقیناً افضل تھے پھر آپ نے اس کی نفی کیوں فرمائی؟

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہی تو افضل ہونے کی دلیل ہے۔ جو افضل ہوتے ہیں وہ یہی کہا کرتے ہیں کہ میں افضل نہیں ۔شاگردوں نے پھر اشکال کیا۔ حضرت گنگوہی نے پھر سمجھایا۔ لیکن طلباء نے عرض کیا کہ حضرت ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا۔ اس پر حضرت نے فرمایا، اچھا میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ اپنے سے افضل یا کمتر؟

سب نے بیک زبان عرض کیا کہ حضرت چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ ہماری حقیقت ہی کیا ہے حضرت کے سامنے۔ پھر فرمایا اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم مجھے سچا سمجھتے ہو کہ جھوٹا؟ عرض کیا بالکل سچا۔ پھر فرمایا اگر میں کسی بات کی قسم کھا کر کہوں پھر تم مجھے سچا سمجھو گے یا نہیں؟ کہا کہ تب تو اور بھی زیادہ آپ کی بات کا یقین کریں گے۔ جب ان سب باتوں کا اقرار کرا چکے تو فرمایا کہ میں اب قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تم میں سے ہر ہر شخص کو اپنے سے ہزار درجہ افضل سمجھتا ہوں۔

بس یہ فرمانا تھا کہ ساری مجلس تڑپ گئی، سب بے تاب ہو گئے، لوٹنے لگے اور مولانا گنگوہی چپکے سے اُٹھ کر حجرے میں جا بیٹھے درس وغیرہ ختم ہو گیا۔

اگلے دن جب سبق شروع ہوا تو فرمایا کہو بھئی! اب بھی اس حدیث میں کچھ شبہ ہے؟ سب نے بالاتفاق عرض کیا کہ حضرت اب تو کوئی شبہ نہیں رہا۔ (فخر العلماء، ص:۱۸۷)

۱۲۸۳ھ میں جب دار العلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت سے آپ

دیوبند پہنچے۔ یوں دارالعلوم میں گنگوہ کے پہلے طالب علم آپ ہی تھے۔ پہلے سال ہی میں آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے ہم سبق تھے۔

مولانا اصغرحسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف ''حیات شیخ الہند'' میں مولانا فخرالحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شیخ الہند مولانا محمودحسن رحمۃ اللہ علیہ کا بے تکلف ہم سبق تحریر کیا ہے۔ اور اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۲۰ پر جہاں حضرت شیخ الہند مولانا محمودحسن رحمۃ اللہ علیہ کی سند فراغ اور دستار فضیلت کا ذکر کیا ہے وہیں حضرت مولانا فخرالحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی بھی تحریر کیا ہے۔ ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ میں دارالعلوم دیوبند کا جلسہ دستار بندی ہوا تھا۔

یہ دیوبند ہی کا قیام تو تھا جس میں مولانا فخرالحسن گنگوہی، قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد بنے، زیر اثر آئے اور حضرت قاسم العلوم کی ذاتی توجہ، محبت اور شفقت ہی نے تو انہیں فخر العلماء بنا دیا تھا۔

پروفیسر انوارالحسن شیرکوٹی مرحوم نے ''قاسم العلوم'' کے صفحہ نمبر ۹۷ پر تحریر فرمایا ہے کہ:

> ''مولانا فخرالحسن نے دارالعلوم دیوبند کے علاوہ سفر وحضر میں حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ سے حدیث اور دیگر علوم کی کتابیں بھی پڑھیں۔ میرٹھ، نانوتہ اور دیوبند میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔''

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''سوانح قاسمی'' کی جلد اول میں بھی آپ کا تذکرہ کیا ہے۔

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ آپ کا جو عقیدت کا معاملہ تھا اور حضرت کی جو آپ پہ شفقت تھی اس کی تفصیلات جاننے کے لیے مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ''سوانح قاسمی'' اور مولانا انوارالحسن شیرکوٹی کی مرتب کردہ کتاب ''قاسم العلوم مع انوارالنجوم'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک اور خواہش پر جو مدارس قائم ہوئے ان میں مدرسہ اسلامی عربی نگینہ بجنور بھی تھا۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے تکمیل علوم وفنون کے بعد مولانا فخرالحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو اس مدرسہ کا صدر مدرس بنا کر نگینہ بجنور بھیج دیا تھا۔

مولانا فخرالحسن گنگوہی کی نگینہ آمد 1874ء کے اواخر میں ہوئی، 20 برس تک آپ نے وہاں رہ کر لوگوں کی دینی رہنمائی فرمائی۔ بعد میں مدرسہ کے حالات ایسے ہوگئے تھے کہ آپ کو مجبوراً مدرسہ سے علیحدہ ہونا پڑا۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اس حوالہ سے بھی ان کی مکاتبت رہی، جس کی تفصیلات پروفیسر انوار

الحسن شیر کوٹی مرحوم کی کتاب '' قاسم العلوم مع انوار النجوم '' میں دیکھی جا سکتی ہیں۔
مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک گرامی نامہ میں ان کو تحریر فرمایا تھا کہ:

''میرے عزیز گرامی ! اگر اپنی ملازمت کی جگہ (نگینہ) سے اٹھیں تو اس ناچیز کی سمجھ میں یہ بھلا معلوم ہوتا ہے کہ اوّل دہلی پہنچیں اور منشی ممتاز علی صاحب اور منشی عبد الرزاق صاحب سے ملاقات کریں، شاید مطبع میں تصحیح کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔''

چنانچہ آپ نگینہ سے دہلی تشریف لائے اور مطبع مجتبائی میں تصحیح کتب کا کام شروع کیا۔ یہیں پہ آپ نے '' ابن ماجہ '' کی تصحیح بھی فرمائی جو یقیناً بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔

۱۲۹۲ھ سے لے کر ۱۲۹۴ھ تک آپ دہلی میں مقیم رہے، یہیں پہ مدرسہ عبد الرّب میں آپ نے تدریس شروع کی۔ اور تقریباً دو سال آپ نے یہاں کتب دینیہ کا درس دیا، آپ کے یہاں قیام ہی کی وجہ سے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جب دہلی تشریف لائے تو مدرسہ عبد الرّب ہی میں آپ کے پاس قیام فرمایا۔

۱۲۹۴ھ میں آپ نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اس سفر حج میں مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سمیت تقریباً ایک سو علماء کرام شریک تھے۔

جب یہ قافلہ مکہ مکرمہ پہنچا تو خود سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ ان کے استقبال کے لئے تشریف لائے۔ ان حضرات کا قیام بھی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قیام گاہ کے بالا خانہ پر تھا۔

مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کے لیے اکثر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اوپر تشریف لے جاتے تو دونوں حضرات، حضرت کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور پھر نہایت ادب واحترام کے ساتھ دوزانو ہو کر حضرت کے سامنے بیٹھے رہتے۔

یہ قافلہ جب مدینہ منورہ روانہ ہوا تو مولانا منصور علی مرحوم کے بقول '' جب منزل بہ منزل مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا جہاں سے روضہ مبارک نظر آتا تھا، فوراً مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے نعلین اتار کر بغل میں دبا لیے اور ننگے پاؤں چلنا شروع کر دیا۔''

سفر حج سے واپسی پر مولانا فخر الحسن گنگوہی نے دہلی کو خیر آباد کہا اور خورجہ ضلع بلند شہر تشریف لے گئے۔ یہاں بھی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دینی ادارہ قائم فرمایا تھا، یہیں مولانا احمد حسن امروہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی درس دیا تھا۔

۱۲۹۵ھ سے لے کر ۱۲۹۷ھ تک دو سال آپ نے یہاں تدریس کی۔
آپ کا قیام خورجہ ہی میں تھا کہ قاسم العلوم حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ علیل ہو گئے۔ان کی علالت کے باعث اکثر آپ کو خورجہ سے دیوبند آنا پڑتا اور کئی کئی دن حضرت کی خدمت میں رہنا پڑتا۔
اس دورانیہ میں آپ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ ''رڑکی'' بھی تشریف لے گئے جہاں ''سوامی دیانند'' کے خلاف مناظرہ میں حصہ لیا۔حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی علالت بڑھتی ہی رہی اور بالآخر 15 اپریل 1880ء کو دیوبند میں حضرت کی وفات حسرت آیات کا سانحہ پیش آیا۔
حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد مولانا فخر الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔مشفق استاد گرامی کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو آپ کی زندگی میں بھی اندھیرا سا چھا گیا۔دور طالب علمی سے لے کر حضرت قاسم العلوم کے وصال تک ہر معاملہ میں آپ کو اپنے استاد محترم کی رہنمائی حاصل تھی اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ پر حد درجہ اعتبار فرماتے تھے۔جب تک حضرت نانوتویؒ حیات تھے جہاں جانے کا حکم دیا چلے گئے۔جہاں پڑھانے کی ہدایت کی وہاں پڑھانا شروع کر دیا، جہاں کتابوں کی تصحیح کی طرف اشارہ کیا تو اس کام میں لگ گئے، جب حکم دیا کہ شاہ جہان پور چلو تو یہ حاضر تھے، جب رڑکی جانے کا حکم ہوا تو وہاں موجود تھے۔
پروفیسر انوار الحسن شیر کوٹی کے بقول ''مولانا فخر الحسن صاحب فراغت کے بعد نگینہ، خورجہ اور دہلی کے مدرسوں میں مدرس رہے۔اب انہیں ان جگہوں پر بھیجنے والا دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔''
مولا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال نے مولانا فخر الحسن کے نظام حیات کی کایا پلٹ دی تھی۔یوں انہوں نے حضرت کے انتقال کے بعد درس وتدریس کے شعبہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ دیا۔حضرت نانوتویؒ کی رحلت کا اثر مرتے دم تک ان پر باقی رہا وہ حضرت کی رحلت کے بعد 17 سال زندہ تو رہے لیکن یہ زندگی ایسی تھی جو حسرت ویاس کی مستقل آماجگاہ تھی۔
مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا غم غلط کرنے کے لیے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح لکھی۔علوم قاسمی کی اشاعت کا بیڑہ اٹھالیا اور اس کام میں اپنے آپ کو اتنا منہمک کر لیا کہ وہ ان کی زندگی کے تمام کاموں پر حاوی ہو گیا۔
''انوار قاسمی'' کے صفحہ نمبر 432 پر مولانا انوار الحسن شیر کوٹی کا یہ اعتراف موجود ہے کہ

> ''حضرت قاسم العلوم کے مضامین عالیہ اور علمی تبرکات کو شائع کرنے میں جس قدر مولانا فخر الحسن پیش پیش تھے اتنا کوئی بھی نہ تھا۔''

مباحثہ ''رڑکی'' کی جو روئیداد آپ نے انتصار الاسلام کے نام سے شائع فرمائی اس میں حضرت قاسم العلوم کی رحلت پر جس کربناک انداز میں تبصرہ فرمایا ہے اس سے ان کے رنج وغم کا ایک ہلکا سا اندازہ ہوتا ہے۔تحریر فرماتے ہیں:

''حیف صد حیف کہ زمانہ ایسے امام ربانی سے جو اپنے زمانہ میں نظیر نہیں رکھتا تھا خالی ہو گیا۔افسوس صد افسوس ہزار افسوس کہ حامی شریعت جو نہ فقط اپنی جان بلکہ پڑوسیوں کی بھی جانیں شریعت کی حمایت میں جھونک دے اس وقت دنیا سے اُٹھ جائے۔ہائے وہ باغ اسلام کا باغبان کہاں گیا جو اس باغ کی حفاظت کرتا تھا جس سے اس کو رونق تھی ،ہائے اب اس باغ کی خدمت کون کرے گا اس کی روشیں کون درست کرے گا۔

خس وخاشاک سے صحن چمن دین کس طرح صاف ہوگا۔ہائے وہ نخل بند گلستان اسلام کدھر گیا جو سرو اسلام یعنی صراط مستقیم کی درستگی وموزونی کی فکر رکھتا تھا۔ہائے وہ جاروب کش باغ دین کہاں گیا جس کی تقریر خس وخاشاک اوہام کے لیے جاروب تھی ،اب سوائے حسرت وافسوس کے کچھ نہیں ہوسکتا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا۔البتہ ایک ذات وحدہٗ لاشریک جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔''

(الانتصار الاسلام،صفحہ نمبر ۸)

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ان کی سوانح کا کام سب سے پہلے شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوا۔حضرت کے صاحبزادے مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بہت بڑا پلندہ جس میں حضرت نانوتوی کے ملفوظات،واقعات،مکتوبات اور حالات زندگی کا ایک بڑا ذخیرہ بندھا ہوا تھا،حضرت شیخ الہند کو لا کر پیش کر دیا تھا ۔مولانا اس سے بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ اب سوانح مرتب کروں گا اور ان قلمی یادداشتوں سے میرا ذہن ان سینکڑوں واقعات کی طرف منتقل ہوگا جو میرے ذہن اور سینہ کی امانت ہیں۔اب انشاءاللہ وہ سینہ سے سفینہ میں آجائیں گے۔

مولانا محمد احمد صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اس پلندہ کو لے کر مردانہ بیٹھک کی الماری میں رکھ کر خوش خوش گھر تشریف لے گئے ۔شاید ایک گھنٹہ بعد ہی جب اس ذخیرہ کو لینے کے لیے باہر تشریف لائے اور الماری کھولی تو پلندہ غائب ہو تھا،پھر ہر چند اسے تلاش کیا اور خاک تک چھان ماری مگر پلندہ نہ ملا۔

فرمایا کہ حضرت مولانا محمود حسن اور ہم سب پر اس درجہ اس کا صدمہ پڑا کہ جیسے حضرت نانوتوی کی وفات آج ہوئی ہے

اور عرصہ دراز تک یہ صدمہ اور حیرت ہم پر چھائی رہی۔ بالآخر صبر کر بیٹھ رہے۔

مندرجہ بالا تفصیل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''سوانح قاسمی'' کے مقدمہ میں صفحہ نمبر ۱۰ پر تحریر فرمائی ہے۔

حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ نے بھی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مفصل سوانح لکھی تھی۔ اس کی روئیداد بھی قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔

''حضرت والد مرحوم ہی نے فرمایا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی ایک مفصل سوانح جس میں کثرت سے علوم و معارف اور مختلف علمی حقائق کو اسباب حدوث اور واقعات کے ساتھ بیان کیا گیا تھا، مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ (تلمیذ خاص حضرت نانوتوی قدس سرہٗ) نے مرتب کی جو تقریباً ایک ہزار صفحات تک پہنچ چکی تھی اور سلسلہ آگے بھی چلا۔ یہ گویا حضرت کی علمی سوانح تھی جس میں سیرت و کردار پر کافی روشنی ڈالی گئی تھی۔ چنانچہ اس کا تذکرہ مولانا فخر الحسن صاحب کے بعض اعلانات میں بھی ملتا ہے۔ جس کی طباعت کا وعدہ بھی، طباعت و کتابت اور کاغذ کی سہولت میسر آجانے پر کیا گیا تھا۔

حضرت والا صاحب نے فرمایا کہ مولانا فخر الحسن اپنی خانگی مجبوریوں سے گنگوہ کی سکونت ترک فرما کر کانپور منتقل ہوئے۔ مکان کا ایک حصہ اپنی کتابوں کے لیے مخصوص کر لیا۔ اسی میں یہ سب قلمی یاداشتیں بھی رکھ دیں۔ اس کتب خانہ کی ترتیب کے چند دن بعد ہی ان کے کتب خانہ کو آگ لگا دی گئی۔ جس سے سارا کتب خانہ جل کر راکھ ہو گیا اور اسی میں وہ سوانح کا مسودہ بھی ضائع ہو گیا۔''

(سوانح قاسمی صفحہ نمبر 10-11)

اس مسودہ سے متعلق دوسری روایات ہیں وہ جنہیں جناب سید اشتیاق اظہر صاحب نے اپنی کتاب ''فخر العلماء مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ کی سوانح اور خدمات'' کے صفحہ نمبر 237 تا صفحہ نمبر 244 میں بیان کیا۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسودہ دار العلوم دیوبند پہنچا تھا، پھر نہ معلوم کیا اسباب ہوئے کہ وہ قیمتی مسودہ ضائع ہو گیا۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

افکارِ قاسمی کے لیے اشاعتی کوششیں: فخر العلماء مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے قاسم العلوم مولانا محمد قاسم

نانوتوی رحمۃ اللہ کی تصانیف کی اشاعت کے حوالہ سے جو کوششیں کیں ان کا مختصراً تذکرہ درج ذیل ہے۔

(۱) تقریر دل پذیر: یہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی آخری تصنیف ہے اور اس کی تکمیل سے پہلے ہی حضرت کا انتقال ہو گیا تھا، یہ کتاب مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں طبع ہوئی۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے لکھا:

> ''سخت افسوس ہے کہ یہ رسالہ پورا بھی نہ ہونے پایا، ادھورا ہی تھا کہ مصنف مرحوم خلد بریں کو تشریف لے گئے اور یہ رسالہ کیا، بہت سے کام ادھورے رہ گئے۔ مصنف مرحوم فرماتے تھے کہ دو بحثیں لکھنی باقی ہیں ایک بحث تو قبلہ اور احکام متعلقہ قبلہ کی رہ گئی ہے۔ دوسری یہ بحث رہ گئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو خدا کے ساتھ کیا ربط ہے اور نبیوں میں آپس میں بہ اعتبار مرتبہ کیا فرق ہے اور کیوں؟''

(۲) حجۃ الاسلام: حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری اہم تصنیف ہے اور حضرت مولانا فخر الحسن رحمۃ اللہ علیہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سب سے مطبع مجتبائی سے اسے شائع کرایا۔

اس کے دیباچہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

> ''مولانا مولوی فخر الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے مضامین کے لحاظ سے اس کا نام حجۃ الاسلام تجویز فرما کر اوّل بار شائع فرمایا تھا۔''

(۳) انتصار الاسلام: حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا یک اہم علمی کارنامہ وہ تقریریں ہیں جو آپ نے رڑکی میں پنڈت دیانند سرسوتی کے مقابلہ میں کیں اور جنہیں مولانا فخر الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے ''انتصار الاسلام'' کے نام سے شائع فرمایا ہے۔

اس کے مقدمہ میں انہوں نے لکھا کہ:

> ''کمترین فخر الحسن عفی اللہ عنہ خدمات عالیہ میں ناظرین رسالہ ہذا کی عرض پرداز ہے کہ یہ جو رسالہ جس کا نام ''انتصار الاسلام'' کمترین نے رکھا ہے، مصنفہ جناب آیت من آیات اللہ، حجۃ اللہ فی الارض، سلطان الاذکیاء، صوفی صافی، غازی، حاجی، حافظ، مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم ومغفور طاب اللہ ثراہ کا ہے۔''

(۴) قبلہ نُما: استقبال قبلہ پر پنڈت دیانند سرسوتی نے جو اعتراضات کئے ان کا جواب حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''قبلہ نما'' کے نام سے تحریر فرمایا۔

مولانا فخر الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے دیباچہ میں لکھا کہ:

''خانہ کعبہ کی طرف سجدہ کرنے پر جو اعتراض ہے اس کا جواب چونکہ بہت شرح وبسط رکھتا ہے اس کو جناب مصنف مرحوم نے ایک جدا رسالہ کر دیا ہے اور اس کا نام ''قبلہ نما'' فرمایا کرتے تھے۔''

اسی دیباچہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

''القصہ انتصار الاسلام گو عجیب رسالہ ہے مگر ''قبلہ نما'' عجیب وغریب ہے۔ غالباً کئی صدی سے کسی کان نے ایسے مضامین عالیہ نہ سُنے ہوں گے اور نہ کسی آنکھ نے دیکھے ہوں گے۔''

(۵) مباحثہ شاہجہان پور: 1876ء میں تحقیقات مذاہب کے سلسلہ میں چاند پور ضلع شاہ جہاں پور میں جو جلسہ ہوا تھا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں شرکت فرمائی تھی۔ اس میں حضرت نے حقانیت اسلام پر جو تقاریر کیں اور عیسائیوں کے اعتراضات کا جو جواب دیا اس کو مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے مباحثہ شاہجہان پور کے نام سے شائع کیا۔

(۶) قصائد قاسمی: حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے قصائد بھی سب سے پہلے مولانا فخر الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں ۱۳۰۹ء میں طبع ہوئے تھے۔ اس کا تذکرہ قصائد قاسمی کے صفحہ نمبر 14 اور 15 پر موجود ہے۔

بیعت: آپ کا جو تعلق خاطر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تھا اُسی کے باعث انہیں اپنی روحانی تسکین کے لیے کسی اور کے سامنے دامن پھیلانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور دو طالب علمی ہی میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے تھے۔

حلیہ: مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ میانہ قد، گنذار جسم، آنکھیں خوشنما اور جاذب، دانت بے حد حسین، موتی کی طرح، چہرا بھرا ہوا، رنگ گندمی، داڑھی گھنی تھی۔

نزہۃ الخواطر جلد نمبر 8 صفحہ نمبر 354 پر حضرت مولانا سید عبد الحی الحسنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ

''حضرت فخر العلماء صورتاً حسین وجمیل، تن وتوش والے اور خوش مزاج انسان تھے۔''

فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے علمی، تصنیفی، تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد آپ نے اپنے دور کے مایہ ناز طبیب اور خاندانِ شریفی کی ممتاز شخصیت حکیم محمود خانِ اعظم سے علوم طب کی تکمیل کی اور ان ہی کی نگرانی میں ان کے زیر ہدایت نسخہ نویسی شروع کی اور چند ماہ میں وہ استعداد حاصل کر لی کہ حکیم محمود خان صاحب کو ان پر فخر ہونے لگا۔ حکیم محمود احمد خان ہی کے ایماء پر آپ کانپور تشریف لے گئے، یہاں باقاعدہ مطب کیا اور حکیم دہلوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ کانپور میں قیام کو بارہ سال کی مدت گذری کہ آپ بیمار پڑ گئے۔ خاندانی روایت کے مطابق آپ ذیابیطس کے پُرانے مریض تھے اور یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ بعض حلقوں کے مطابق شنگرف کے کُشتہ کے ردِّ عمل نے ان کو مرض الموت میں مبتلا کر دیا۔

فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ابتداء میں خود اپنا علاج کیا مگر جب افاقہ نہ ہوا تو پھر دوسرے حکماء سے رجوع کیا۔ لیکن انہوں نے بھی جو دوائیں تجویز کیں آپ ان کو پہلے ہی استعمال کر چکے تھے۔

اور یوں 1897ء میں آپ کا وصال ہو گیا اور بساطوں کے قبرستان کانپور میں آپ کی تدفین ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

آخر دل بے قرار کو قرار آ ہی گیا

نوٹ: اس مضمون کی تیاری کے لیے ہم نے درج ذیل کتب سے استفادہ کیا ہے۔

(۱) تذکرۃ الرشید۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

(۲) چودھویں صدی کے علمائے برصغیر۔ اردو ترجمہ: مولانا انوار الحق قاسمی صاحب

(۳) سوانح قاسمی۔ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

(۴) حیات شیخ الہند۔ حضرت مولانا سید اصغر حسین رحمۃ اللہ علیہ

(۵) نادر مجموعہ رسائل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ: ناشر: میر محمد کتب خانہ، آرام باغ کراچی،

(۶) احوال و آثار و باقیات و متعلقات قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، مرتب: مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی مدظلہ

(۷) فخر العلماء مولانا فخر الحسن گنگوہی کی سوانح اور خدمات۔ سید اشتیاق اظہر
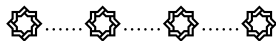
آپ کے مسائل اور اُن کا شرعی حل

مولانا حبیب اللہ اختر

سوال

اصول فقہ کی روشنی میں حقیقت اور مجاز میں کیا فرق ہے؟
میلا د چوک کے معنی ہیں، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش، اس کی کیا حقیقت ہے؟
قرآن مجید کے پارہ نمبر ۳، سورۃ آل عمران آیت نمبر ۵۴ میں ہے کہ'' کافروں نے مکر کیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی مکر یعنی خفیہ تدبیر کی، اللہ تعالیٰ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔''
اس کی مفصل وضاحت کریں۔

سائل: آصف محمود، بھیں ضلع چکوال۔

جواب

حدیث شریف میں آتا ہے:

من حسن اسلام المرء تركه مالايعنيه.
(سنن الترمذي، كتاب الزهد، باب، رقم الحديث : ٢٣١٧)

کہ آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے۔

یعنی ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ ایسے کام کرے جن میں اس کی آخرت کا فائدہ ہو۔
اس لیے آپ بھی ایسے سوالات کیجیے جن میں آپ کی آخرت کا فائدہ ہے۔ اور اس طرح کے فضول سوالات سے گریز کیجیے۔ تاکہ نہ آپ کا وقت ضائع ہو نہ ہمارا۔

سوال

میرا نکاح تین ماہ قبل عمران ولد محمد اسلام سے ہوا، نکاح کے دو ماہ بعد انہوں نے بقائمی ہوش وحواس مجھے تین دفعہ طلاق

دی۔ کیا اب میں ان کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی گذار سکتی ہوں؟

کیا اک دفعہ طلاق، طلاق، طلاق کہنے سے طلاق واقع ہوجاتی ہے؟ جب کہ اس کو گواہ میرے اپنے علاوہ اور کوئی نہیں۔

کیا میرا نکاح اب دوسری جگہ ہوسکتا ہے؟

میرے خاوند کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی، اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ماہ کے بعد ایک طلاق دی جائے، دوسرے ماہ دوسری اور تیسرے ماہ تیسری، میں نے چونکہ ایسے نہیں کیا ایک ہی دفعہ طلاق طلاق طلاق کہہ دیا تھا، اس لیے یہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔

اب آپ فرمائیں کہ میرے لیے شرعی حکم کیا ہے؟

سائلہ: بنت محمد نذیر۔ راولپنڈی

جواب

صورت مسئولہ میں آپ پر تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں اس لیے کہ ایک ہی دفعہ طلاق، طلاق، طلاق کہنے سے تینوں طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں۔ آپ کے شوہر کا یہ کہنا درست نہیں کہ اس طرح طلاق نہیں ہوتی۔ اب آپ اپنے شوہر کے نکاح سے مکمل طور پر نکل چکی ہیں، لہٰذا اب آپ اپنی عدت (تین ماہواریاں یا تین ماہ اگر آپ امید سے نہیں ہیں) پوری ہونے کے بعد اپنے موجودہ شوہر کے علاوہ جہاں چاہیں نکاح کرسکتی ہیں۔ اگر انہی سے دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو تحلیل شرعی ضروری ہوگی۔

فـي التـنـويـر مـع شرحه : والبدعي ثلاث متفرقة،(قوله ثلاث متفرقة) و كذا بكلمة واحدة بالأولى.(ج:۹،ص:۱۰۹)

سوال

میرے بیٹے نے غصے کی حالت میں اپنی بیوی سے یہ کہا کہ اب اگر میں تمہیں اپنے گھر میں رکھوں تو گویا اپنی ماں کو رکھوں۔
یہ لفظ اس نے صرف ایک بار کہے۔ ان کی شرعی حیثیت سے آگاہ فرمائیں۔

سائل: محمد معروف، بہارہ کہو اسلام آباد

جواب

صورت مسئولہ میں آپ کے بیٹے کی بیوی پر ایک طلاق بائن واقع ہو چکی ہے۔یعنی ان دونوں کا نکاح آپس میں ختم ہو چکا ہے اب اگر دونوں اکھٹے رہنا چاہیں تو نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنا ضروری ہوگا۔

سوال

ہماری شادی 6 برس قبل ہوئی تھی، ایک بچی بھی ہے۔ایک گھریلو تنازعہ کے باعث ٹیلی فون پر میرے خاوند نے مجھے دو دفعہ یوں کہا کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، اس کے بعد میں نے ریسیور اپنے سُسر صاحب کو دے دیا۔انہوں نے اپنے بیٹے کو گالی دیتے ہوئے کہا کہ اگر تمہاری بات کا مولوی صاحب کو پتہ چل گیا تو بیوی حرام ہوجائے گی اور ساتھ ہی فون بند کردیا، مجھے بھی ڈرا دھمکا کر چپ کرا دیا گیا۔

دو طلاق دینے کے بعد نہ ہی انہوں نے رجوع کیا اور نہ ہی ہمارے ازدواجی تعلقات استوار ہوئے۔میں ایک سُنی العقیدہ مسلمان ہوں، آخرت عزیز ہے۔

عدالت میں تنسیخ نکاح کا دعویٰ بھی دائر کیا ہوا ہے۔آپ فرمائیں کہ شرعی نقطہ نگاہ سے مجھے کیا کرنا چاہیے۔میرے شوہر بہت ظالم ہیں اور کئی دفعہ مار پٹائی بھی کر چکے ہیں جس کے گاؤں والے بھی گواہ ہیں۔

آپ اس حوالہ سے میری شرعی رہنمائی فرمائیں۔

سائلہ: بنتِ شیر محمد، بھلوال ضلع سرگودھا

جواب

شرعاً آپ پر دو طلاقیں واقع ہو چکی ہیں اور آپ کا نکاح اپنے شوہر سے ختم ہو چکا ہے۔اب آپ کے لیے اپنے سابقہ شوہر کے ساتھ رہنا یا ان کا آپ کے ساتھ تعلق قائم کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

اگر آپ امید سے نہیں ہیں اور ماہواری میں کوئی بے قاعدگی بھی نہیں ہے تو آپ کی عدت بھی پوری ہو چکی ہے۔اب آپ چاہیں تو کسی اور جگہ نکاح کر سکتی ہیں۔

اگر آپ کے سابقہ شوہر آپ کو بسانا چاہتے ہیں تو اس مقصد کے لیے ان کو نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنا ضروری ہوگا۔

سوال

میری اہلیہ خوشی سے اپنے والدین کے گھر گئی، میرے بلانے پر واپس نہ آئی تو فون پر باتوں ہی باتوں میں تلخی ہوگئی۔اور میں نے دومرتبہ اسے کہہ دیا کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔اس کے بعد میں نے یا اس نے فون بند کر دیا۔اب فرمائیں کہ ایسا کہنے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے کہ نہیں؟

سائل: عاصم افتخار، سٹیلائیٹ ٹاؤن، راولپنڈی

جواب

آپ کے ان الفاظ سے آپ کی بیوی مکمل طور پر نہیں نکلی لہذا آپ اسے واپس لا سکتے ہیں بشرطیکہ ابھی اس کی عدت نہ گزری ہو۔اور آگر اس کی عدت گزر چکی ہے تو آپ کا نکاح اپنی بیوی سے ختم ہو چکا ہے۔لہذا اب اگر آپ اپنی بیوی کو واپس لانا چاہتے ہیں تو دوبارہ نکاح کرنا ضروری ہوگا۔

لیکن خیال رہے کہ آئندہ کبھی بھی اگر آپ نے اپنی بیوی کو ایک طلاق بھی دی تو آپ کی بیوی آپ کے لیے حرام ہو جائے گی۔اور پھر نکاح کی بھی کوئی صورت سوائے تحلیل شرعی کے باقی نہیں رہے گی۔

فی الدر المحتار: (يقع بها) أی بهذه الألفاظ وما بمعناها من الصريح (واحدة رجعية وان نوی خلافها أو لم ينو شيئا). (ج:۳،ص: ۲٤۸)

سوال

(۱)عورتوں کو چہرے کے زائد بالوں کا صاف کرنا اور اَبرو (Eyebrow) بنوانا کیسا ہے؟

(۲) میرا کوئی قریبی عزیز مجھ سے اپنا رویہ صحیح نہ رکھے اور باتیں بھی ایسی کرے جو مجھے ناگوار گزرتی ہوں اور وہ میرا ہمدرد بھی نہ ہو تو اس کے متعلق دل میں کچھ نہ کچھ کینہ آ ہی جاتا ہے۔

آپ نے اپنے ایک بیان میں فرمایا تھا کہ جو لوگ دل میں کینہ نہیں رکھتے اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں جگہ دیں گے تو ایسی صورت میں کینہ سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

(۳) اگر دس گیارہ سال کی عمر میں کسی کے خوف سے جھوٹی قسم کھالی ہو تو اس کا کفارہ کیا ہے؟

(۴) اگر کسی شخص کے اردگرد ایسے لوگ ہوں جن کے ساتھ ہمیشہ ہی اختلاف رہتا ہو، سوچوں میں بھی فرق ہو تو صبر اور برداشت پیدا کرنے کے لیے اور اپنی زبان بند رکھنے کے لیے کیا کِیا جائے؟

سائلہ: آپ کی ایک بہن

جواب

(1) عورت کے لیے چہرے کے زائد بال صاف کرنا جائز ہے لیکن ابرو (Eyebrow) بنوانا (Shape) حرام ہے۔

عن ابن عباس قال: لعنت الواصلة والمستوصله والنامصة والمتنمصةوالواشمة والمستوشمة من غير داء.(سنن أبي داؤد، كتا ب الترجل ، باب في صلة الشعر ،رقم الحديث : ٤١٧٠، ج:٣، ص:٨٠)

قال ابو داؤد: وتفسير الواصلة التي تصل الشعر بشعر النساء، والمستوصلة المعمول بها والنامصة التي تنقش الحاجب حتى ترقه والمتنصة المعمول بها.(ایضاً)

وفي بذل المجهود والنامصة :التي تنقش أي :تنتف (الحاجب)أي: شعر الحاجب (حتى ترقه، والمتنمصة:المعمول بها).(ج:١٢، ص:١٩٩)

وفي حديث مسلم:لعن اللّٰه الواشمات والمستوشمات' والنامصات والمتنمصات. (رقم الحديث:٢١٢٥'ج:٣' ص:٣٩٣)

(2) کینہ دراصل غصے کا نتیجہ ہے۔ جب انسان کسی وجہ سے اپنے غصے کو نافذ نہیں کر پاتا تو دل پر اس کا بوجھ رہتا ہے اور جس پر غصہ ہوتا ہے اس سے نفرت اور بغض پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی دلی نفرت اور بغض کا نام کینہ ہے۔

متعدد احادیث میں کینہ سے منع کی گیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کینہ رکھنا بڑے گناہ کی بات ہے۔ لیکن فقہاء نے اس کی تفصیل کی ہے کہ کس طرح کا کینہ رکھنا باعث گناہ ہے۔ اور کس طرح کے کینے پر گناہ نہیں۔

جب دل میں کینہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں کئی چیزیں جنم لیتی ہیں۔ جس سے کینہ ہے اس سے حسد کرنا، اِس کی مصیبت پر خوش ہونا، اس سے قطع تعلق کر لینا، اس کے دیگر واجب حقوق ادا نہ کرنا وغیرہ۔ بہت سی چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر کینے کا اثر اس طرح کے ظاہری اعمال پر بھی ہونے لگے جو کہ شرعاً ناجائز ہیں تو اس طرح کا کینہ رکھنا گناہ ہے۔ جس پر اللہ کے ہاں مواخذہ ہوگا۔

اور اگر کینے کا اثر ظاہری اعمال میں ظاہر نہ ہو بلکہ صرف دل میں اس شخص کے بارے میں بُرے خیالات و وساوس آتے رہیں تو محض ان خیالات پر کوئی مواخذہ نہیں۔ لیکن واضح رہے کہ اگر جان بوجھ کر دل میں بُرے خیالات لائے گا تو اس پر بھی اللہ کے ہاں مواخذہ ہوگا۔

لیکن سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اگر دل میں بُرے خیالات آئیں تو بھی ان کی طرف توجہ نہ کرے (کیونکہ ممکن ہے کہ یہی خیالات گناہ تک رسائی کا ذریعہ بن جائیں)۔ بلکہ دل میں اس شخص کے بارے میں اچھے خیالات لانے کی کوشش کرے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس شخص سے کینہ ہے اس کی خوبیوں کو بار بار ذہن میں لائے۔ اور اس کی خامیوں کی طرف بالکل توجہ نہ کرے۔ اور احادیث میں کینہ رکھنے پر جو ''وعیدیں'' بیان کی گئی ہیں ان کو پیشِ نظر رکھے۔ امید ہے کہ اس طرح اس مرض سے جان چھوٹ جائے گی اور بہت سے گناہوں سے بھی حفاظت ہو جائے گی۔

بہت سی احادیث میں کینہ رکھنے پر وعیدیں آئی ہیں ان میں سے چند احادیث درج ذیل ہیں:

(1) حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایک دوسرے سے بغض (کینہ) نہ رکھو، اور ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، اور نہ ہی آپس میں قطع تعلقی کرو۔ اور اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن کے رہو۔ اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے (مسلمان) کو تین دن سے زیادہ چھوڑے (ترک تعلق کرے)''۔ (مسلم شریف)

(2) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جنت کے دروازے سوموار اور جمعرات کے دن کھولے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہر اس شخص کی بخشش کر دی جاتی ہے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو۔ سوائے اس آدمی کے جو اپنے (مسلمان) بھائی سے کینہ رکھتا ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم فرماتے ہیں کہ ان دونوں کو مہلت دو۔ یہاں تک کہ یہ آپس میں صلح کر لیں۔ تین دفعہ یہ حکم ہوتا ہے۔ (پھر اگر صلح کر لیں تو ان کی بھی بخشش کر دی جاتی ہے)''۔ (مسلم شریف)

(3) اس طرح کی ''قسم'' سے کفارہ واجب نہیں ہوتا۔

(4) جتنا ہو سکے آپس میں جھگڑے سے بچنا چاہیے۔ اس لیے کہ آپس کا جھگڑا نیکیوں کو ضائع کر دیتا ہے۔ اگر صرف اسی بات کو ہر وقت ذہن میں رکھا جائے تو امید ہے جھگڑے کی نوبت نہیں آئے گی۔ صبر، برداشت، زبان کی حفاظت یہ تمام بہت اچھی صفات ہیں۔ ان کو اپنے اندر پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث ان کے جو فضائل و فوائد اور ان کو نہ اپنانے پر جو نقصانات بیان کیے گئے ہیں ان کو پڑھے اور ذہن میں ہر وقت ان کو حاضر رکھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ کے کسی نیک بندے کے ساتھ تعلق رکھے اور اُس سے ان چیزوں کو سیکھے۔
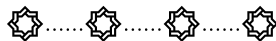
تبصرہ کتب

محمد اورنگ زیب اعوان

نام کتاب: احوال دبیر رحمۃ اللہ علیہ
(سوانح حیات رئیس المناظرین، ابوالفضل، مولانا قاضی کرم الدین رحمۃ اللہ علیہ)
مصنف: حافظ عبدالجبار سلفی
صفحات: 374
قیمت: 200
ناشر: گوشہ علم H-1 182۔ واپڈا ٹاؤن۔ لاہور

مولانا حافظ عبدالجبار سلفی، علمی و دینی حلقوں میں ایک اُبھرتا ہوا نمایاں نام ہے۔ بہت کم عرصہ میں انہوں نے بہت زیادہ علمی و تحقیقی خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے ان کا تازہ ترین علمی و تحقیقی کارنامہ ''احوال دبیر'' کے نام سے موجود ہے۔

مولانا قاضی کرم الدین دبیر رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا قاضی مظہر حسین رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی تھے۔ آپ ایک متبحر عالم دین، باکمال مناظر اسلام، بہترین شاعر، باوقار ادیب، عظیم مصنف، اور اہل السنۃ والجماعۃ کے بے باک ترجمان تھے۔

تازیانہ عبرت، آفتاب ہدایت، ماہنامہ حق چار یارؓ، کے ''مکاتیب شیخ الادب نمبر'' اور قاضی مظہر حسین رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں میں گاہے بگاہے آپ کا تذکرہ مل جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک ایسی مفصل کتاب تیار کی جائے جو آپ کے شایان شان ہو۔

خوش قسمتی سے یہ قرعہ فال برادر عزیز مولانا عبدالجبار صاحب سلفیؔ کے نام نکلا۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔
سلفیؔ صاحب نے بڑی محنت، ہمت، جانفشانی اور لگن سے اس جانگسل فریضہ کو سرانجام دیا اور یوں سو سالہ تاریخ کے بکھرے موتیوں کو انتہائی اختصار اور جامعیت کے ساتھ یکجا کر دیا۔ فجزاہ اللہ عنا احسن الجزاء

یہ کتاب اُنیس ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل سے پہلے کے تئیس صفحات انتساب، اہل السنۃ والجماعۃ کی تعریف، پیش گفتار، سوانح نگاری اور ایک دیرینہ خواہش کے عنوانات سے مزین ہیں۔

مولانا کرم الدین دبیر رحمۃ اللہ علیہ کے نام و نسب، ابتدائی حالات، اعوانوں کا نسبی تعلق، سلسلہ تعلیم، مولانا فیض الحسن کا تعارف، فن حدیث کی تکمیل، مولانا محمد حسن فیضی، یادگار مضمون، دردناک مرثیہ، مولانا دبیرؒ کا ابتدائی مسلک و مشرب، ''الصوارم الہندیہ'' پر دستخط، ''ہدیۃ المسلمین'' پر تقریظ، مناظرہ سلانوالی اور دارالعلوم دیوبند کی طرف رجوع، رافضیوں اور خارجیوں کی پریشانی، علامہ خالد محمود کا تبصرہ اور تسامح، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ سے خط و کتابت، غازی منظور حسین شہید کے حالات زندگی، مولانا عبدالحکیم قادری کے اعتراضات کا جواب، قادیانیت کا تعاقب، علامہ فیضی کا مضمون، رفض و بدعت کی بیخ کنی، مناظروں اور مباحثوں کی تفصیلات، مولانا دبیرؒ منصب افتاء پر، خاندان دبیر تحریک خاکسار کے تعاقب میں، حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ پر مرزا قادیانی کی طرف سے سرقے کا الزام اور اصل حقیقت، سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت و خلافت، دارالحرب اور مسئلہ حلّت سود، مولانا دبیر بحیثیت شاعر، اولاد و احفاد اور سفر آخرت وغیرہ عنوانات کے تحت تاریخی مواد پر مشتمل یہ کتاب ہے۔

حیات دبیر کے ذیلی عنوانات کی مختصر سی فہرست اس لیے ہم نے دے دی کہ قارئین کرام اندازہ کر سکیں کہ مولانا عبدالجبار سلفی نے کتنی محنت سے یہ کتاب مرتب کی ہے، مولانا کی یہ محنت لائق صد تحسین و آفرین ہے۔ آپ نے یہ کتاب لکھ کر پوری ایک صدی کا قرض چکا دیا ہے۔ اس شاندار کاوش پر وہ صرف خدام اہل سنت ہی کی طرف سے نہیں بلکہ جمیع اہل السنۃ والجماعۃ کے طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، ترتیب، کاغذ، جِلد، ٹائیٹل سبھی میں سلیقہ مندی نمایاں ہے۔

مولانا عبدالجبار صاحب سلفی نے یہ کتاب لکھ کر اپنا فرض تو ادا کر دیا ہے اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ کتاب کو خریدیں، پڑھیں، دوستوں کو تحفہ دیں، لائبریریوں تک پہنچائیں اور اس علمی، ادبی اور تحقیقی کارنامہ کی قدر کرتے ہوئے اسے اہل السنۃ والجماعۃ میں عام کریں تاکہ ہماری نئی نسل اپنے ان دینی، قومی، تاریخی اور حقیقی محسنوں کی خدمات سے آگاہ ہو سکے۔
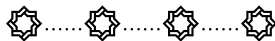
نام کتاب: قلم کے چراغ
(رشحات قلم، آغا شورش کاشمیریؒ)

مرتب: پروفیسر محمد اقبال جاوید

صفحات: 605

قیمت: درج نہیں

ناشر: دارالکتاب۔38، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور۔

جناب پروفیسر محمد اقبال جاوید نے بطل حریت، مجاہد ختم نبوت آغا شورش کاشمیری مرحوم کی غیر مدوّن تحریروں سے اقتباسات لے کر ''قلم کے چراغ'' جلائے ہیں۔ آغا شورش کاشمیری کئی خوبیوں کے مالک تھے مگر ہمارے نزدیک ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جرأت و بہادری کا پیکر تھے، ان کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا۔ اخلاق و کردار اور گفتار کے وہ غازی تھے۔ ان کی حق گوئی و بے باکی ہی نے انہیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا تھا۔ احسان دانش مرحوم نے ان کی جولانی طبع کو دیکھتے ہوئے انہیں عبدالکریم اُلفتؔ سے عبدالکریم شورشؔ بنایا، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مفکر احرار چوہدری افضل حقؒ، اور شاعر انقلاب مولانا ظفر علی خانؒ کی صحبت و رفاقت نے انہیں شہنشاہ خطابت اور ادیبِ بے مثال بنا دیا اور یوں وہ ہر باطل کے خلاف حق کی للکار بن گئے۔

تحریر میں آغا شورش کاشمیری نے مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا ظفر علی خانؒ کا تتبع کیا اور ان کے قلم کے وارث و امین قرار پائے۔

پروفیسر محمد اقبال جاوید نے ''چٹان'' میں بکھری آغا صاحب کی تحریروں کو جمع کیا اور ان بکھرے ہوئے موتیوں کی ایک مالا تیار کر دی گو کہ موتی بکھرے ہوئے بھی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آغا شورش کاشمیری کی تقریر اور تحریر، بانگِ رجز سے انگڑائی لیتی، جوش جنوں کے سانچے میں ڈھلتی، دل گداختہ سے تب و تاب پاتی اور جذب دروں سے نکھرتی ہے............ اور اپنے قلم کے اس خرام ناز پر شورشؔ کو بجا طور پر فخر بھی ہے۔

میں نے جو کچھ بھی کہا تحریر اور تقریر میں
لفظ و معنی اس خزینہ کے ہیں دُرہائے ثمیں
میں خطیب العصر ہوں شاہ اُمم کے فیض سے
ہر معاصر ہے مرے زور قلم کا خوشہ چیں

''قلم کے چراغ'' میں درج ذیل موضوعات پر آغا شورش کاشمیری مرحوم کی منتشر تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے۔

☆ الٰہ العالمین	☆ خطیب اعظم	☆ سانچ اور آنچ
☆ امام الشہداء	☆ صحافت کا وقار	☆ صحافت
☆ رحمۃ اللہ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم	☆ علمی عظمتیں	☆ سیاست
☆ فقراء و علماء	☆ نژاد نو	☆ اقتدار
☆ دین حق اور اس کے تقاضے	☆ تہذیبی قدریں	☆ تملق
☆ جہد آزادی	☆ کار جہاں بے ثبات	☆ جگر لخت لخت
☆ بلالِ مشرق	☆ وقار لوح و قلم	☆ ذاتی فخر و ناز
☆ معمارِ پاکستان	☆ ادبیات	☆ مرثیہ بقلم خود
☆ علم و نظر کا گوہر یکتا	☆ قطعات تاریخ وفات............حضرت رضی شیرازیؒ	

جناب پروفیسر محمد اقبال جاوید نے اس سے قبل ''مضامین شورش'' کے نام سے آغا شورش کاشمیری کی تحریروں کو جمع کیا تھا اب انہوں نے ''قلم کے چراغ'' کے عنوان سے آغا صاحب مرحوم کی تحریروں کو جمع کر دیا ہے۔ ہماری ناقص رائے کے مطابق محترم جناب پروفیسر محمد اقبال جاوید صاحب نے ہفت روزہ ''چٹان'' کا نچوڑ اور خلاصہ ان دونوں کتابوں میں پیش کر دیا ہے۔ ''چٹان'' کی اگر مکمل فائل کسی کی دسترس میں نہ بھی ہو تو مندرجہ بالا دو کتابوں کو پڑھ کر ''چٹان'' کے اسلوب، طرز تحریر اور جرأت و بے باکی کے ادبی معرکوں سے آشنائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

علمی، ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے ''قلم کے چراغ'' یقیناً نعمت غیر مترقبہ ہے۔ امید ہے کہ اس کاوش کو علمی و ادبی حلقوں میں سراہا جائے گا۔

مرتب کتاب پروفیسر محمد اقبال جاوید کے ساتھ ساتھ جناب حافظ ندیم اور جناب شبیر احمد خان میواتی بھی شکریہ کے مستحق ہیں جن کی کتاب دوستی اور شورش شناسی کے باعث ایسی نادر تحریریں زیور طباعت سے آراستہ ہو رہی ہیں۔ اگر ان کا ذوق اشاعت ایسے ہی تر و تازہ رہا تو ہمیں امید ہے کہ مزید جواہرات کی اشاعت بھی ہوتی رہے گی۔

اے کاش کہ ندیم صاحب ''چٹان'' کے ''شورش کاشمیریؒ نمبر'' کو بھی شائع کر دیں تو کتنا ہی اچھا ہو۔
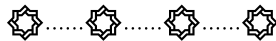
نعت محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم

شورش کاشمیری

ہم پہ ہو تیری رحمت جم جم صلّی اللہ علیک وسلّم
تیرے ثنا خواں عالم عالم صلّی اللہ علیک وسلّم
ہم ہیں تیرے نام کے لیوا اے دھرتی کے پانی دیوا
یہ دھرتی ہے برہم برہم صلّی اللہ علیک وسلّم
تیری رسالت عالم عالم تیری نبوت خاتم خاتم
تیری جلالت پرچم پرچم صلّی اللہ علیک وسلّم
دیکھ تیری اُمّت کی نبضیں ڈوب چکی ہیں ڈُوب رہی ہیں
دِھیرے دِھیرے مدّھم مدّھم صلّی اللہ علیک وسلّم
دیکھ صدف سے موتی ٹپکے دیکھ حیا کے ساغر چھلکے
سب کی آنکھیں پُرنَم پُرنَم صلّی اللہ علیک وسلّم
قریہ قریہ بستی بستی دیکھ مجھے میں دیکھ رہاہوں
نوحہ، نوحہ، ماتم ماتم صلّی اللہ علیک وسلّم
اے آقا اے سب کے آقا ارض وسما ہیں زخمی زخمی
ان زخموں پر مرہم مرہم صلّی اللہ علیک وسلّم